اقبالیات (اردو)

جنوری تا مارچ، ۱۹۶۳ء

مدیر:
ڈاکٹر محمد رفیع الدین

اقبال اکادمی پاکستان

عنوان	:	اقبالیات (جنوری تا مارچ، ۱۹۶۳ء)
مدیر	:	محمد رفیع الدین
پبلشرز	:	اقبال اکادمی پاکستان
شہر	:	کراچی
سال	:	۱۹۶۳ء
درجہ بندی (ڈی۔ڈی۔سی)	:	۱۰۵
درجہ بندی (اقبال اکادمی پاکستان)	:	8U1.66V11
صفحات	:	۱۰۶
سائز	:	۵ء۲۴×۵ء۱۴س م
آئی۔ایس۔ایس۔این	:	۰۰۲۱-۰۷۷۳
موضوعات	:	اقبالیات
	:	فلسفہ
	:	تحقیق

مندرجات

جلد : ۳ | اقبالیات : جنوری تا مارچ، ۱۹۶۳ء | شمارہ : ۴

IQBAL REVIEW

Journal of the Iqbal Academy, Pakistan

THE Journal is devoted to research studies on the life, poetry and thought of Iqbal and publishes articles which explain, elucidate, or develop Iqbal's ideas on politics, ethics, education, history, economics, philosophy, sociology, psychology, literature, art, comparative religion, Islamics, etc.

Published alternately

in

English and Urdu

SUBSCRIPTION

(*for four issues*)

Pakistan	Foreign countries
Rs. 8/-	£ 1

PRICE PER COPY

Pakistan	Foreign countries
Rs. 2/-	5 s.

All contributions should be addressed to the Editor, Iqbal Review, 84, Pakistan Secretariat, Karachi.

Published by Dr. Mohammad Rafiuddin, Director, Iqbal Academy, Pakistan, Karachi and printed by him at the Ferozsons Press, Karachi.

IQBAL REVIEW

Journal of the Iqbal Academy, Pakistan

JANUARY 1963

IN THIS ISSUE

THE IQBAL ACADEMY, PAKISTAN
KARACHI

اقبال ریویو

مجلہ اقبال اکادمی پاکستان

مدیر: ڈاکٹر محمد رفیع الدین   مدیر معاون: خورشید احمد

جلد ۳   جنوری ۱۹۶۳ء   عدد ۴

مندرجات

B

اس شمارے کے مضمون نگار

* محمد عبداللہ قریشی ، لاہور .

* صوفی غلام مصطفیٰ تبسم مدیر اعلیٰ 'لیل و نہار، لاہور.

* بشیر احمد ڈار رفیق ادارہ ثقافت اسلامیہ ۔ لاہور.

* یوسف سلیم چشتی ، لیکچرار ایچیسن کالج ۔ لاہور.

* اکبر علی خاں ، مدیر ، نگار ۔ لکھنؤ .

* محمد امین الاسلام ، ریڈیو پاکستان ، ڈھاکہ .

۱

مولوی محبوب عالم اور اقبال

محمد عبداللہ قریشی

سیالکوٹ سے تعلیم کے سلسلے میں لاہور آنے کے بعد اقبال کو جن احباب کی اولین صحبت میسر آئی، ان میں مولوی محبوب عالم مدیر پیسہ اخبار لاہور بھی تھے۔ ان کے کارخانے میں ماسٹر چراغ ایک دفتری تھا جو سیالکوٹ کا رہنے والا تھا۔ وہ ہارمونیم بہت اچھا بجاتا تھا۔ اقبال کی اس سے دوستی تھی۔ اس وجہ سے بھی اقبال اکثر پیسہ اخبار کے دفتر میں آتے جاتے اور وہاں نشست و برخاست رکھتے تھے۔

اس وقت پنجاب میں پریس کافی ترقی کر چکا تھا اور اخبار بکثرت شائع ہوتے تھے۔ لاہور کا سب سے قدیم اور مشہور اخبار کوہ نور پچاس کے پیٹے میں تھا۔ تین چار اور اخباروں کا بھی بڑا چرچا تھا — مولوی محبوب عالم کا پیسہ اخبار، پنڈت مکند رام گرٹو اور ان کے صاحبزادے پنڈت گوپی ناتھ کا اخبار عام اور مولوی محرم علی چشتی کا رفیق ہند — ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی طرز میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔

بعد میں مولوی انشاء اللہ خاں کا اخبار وطن، منشی محمد الدین فوق کا اخبار پنجۂ فولاد و کشمیری میگزین اور شیخ عبدالقادر کا رسالہ مخزن جاری ہوا اور اقبال نے ایک ہونہار نوجوان کی طرح پریس کی قوت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ ان کے مضامین، ان کی نظمیں، غزلیں، ان کی ذہنی و فکری صلاحیتیں اور دیگر سرگرمیاں جس اخبار کے ذریعے سب سے پہلے عوام کے سامنے آئیں، وہ پیسہ اخبار ھی تھا۔ اس اخبار کی فائلوں میں اقبال کی زندگی سے متعلق معلومات کے بیش بہا خزانے مدفون ھیں جن سے اقبال کے سوانح نگاروں نے کم ھی فائدہ اٹھایا ھے۔

میں اس مضمون میں مولوی محبوب عالم کے تعارف کے ساتھ ساتھ چند واقعات کا بھی ذکر کروں گا جو اقبال کی زندگی پر بالکل نئی روشنی ڈالتے ھیں۔

مولوی محبوب عالم ۱۸۶۳ء میں موضع بھروکی متصل وزیرآباد (ضلع گوجرانوالہ) میں اپنے ننہال کے ھاں پیدا ھوئے۔ برج اٹاری متصل لاہور

میں آپ کے چچا مولوی احمد دین مدرس تھے۔ وہاں آپ نے پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ یہاں سے قصور گئے جہاں آپ کے دوسرے چچا ماسٹر محمدالدین مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور ایک ماہوار رسالہ ''کلید امتحان مڈل و انٹرنس،، بھی نکالا کرتے تھے۔ مڈل کا امتحان وہاں سے پاس کرنے کے بعد ۱۸۸۰ء میں آپ میڈیکل کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح میڈیکل کالج میں داخل ہونے کے لئے ایف ایس سی اور بی ایس سی کی کڑی شرائط نہ تھیں۔ مگر چند ماہ بعد آپ کو یہ کالج چھوڑنا پڑا کیونکہ آپ کے والد مولوی الہ دین کا انتقال ہوگیا اور آپ کے لئے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے وسائل مسدود ہوگئے۔

اب آپ نے امتحان منشی و منشی عالم کی تیاری شروع کی۔ منشی کے امتحان میں صوبہ بھر میں اول رہے، انعام بھی لیا اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ منشی عالم کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ آپ نے ۱۸۸۶ء میں ایک مطبع خادم التعلیم کے نام سے قائم کیا اور اپنے چچا کا رسالہ ''کلید امتحان،، لاہور سے نکالنا شروع کیا مگر بعض گھریلو حالات سے مجبور ہوکر آپ کو مطبع لاہور سے گوجرانوالہ منتقل کرنا پڑا۔ جب وہاں بھی کام نہ چلا اور حالات روبراہ نہ آئے تو آپ اپنے وطن موضع فیروز والہ (ضلع گوجرانوالہ) میں چلے گئے اور وہیں سے ۱۸۸۷ء میں ایک ہفتہ وار اخبار ''ھمت،، اور دوسرا ہفتہ وار اخبار ''سکول ماسٹر،، جاری کیا۔

تجربے سے آپ کو معلوم ہوا کہ پبلک کو ایک سستے اور صحیح معنوں میں اخبار کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ نے ''ھمت،، کو ''پیسہ اخبار،، میں تبدیل کرکے ایک ہی ماہ بعد اپنا پریس اور کاروبار فیروز والہ سے پھر گوجرانوالہ میں منتقل کرلیا۔ پیسہ اخبار کا پہلا پرچہ مولوی محبوب عالم کے چھوٹے بھائی منشی عبدالعزیز نے خود سکولوں میں لے جاکر ایک ایک پیسہ کو فروخت کیا۔ بعد میں اس اخبار نے اتنی ترقی کی کہ یہ اپنی کم قیمت اور دلچسپ مضامین کی بدولت بہت جلد ہندوستان کا ٹٹ بٹس (TIT BITS) بن گیا۔

پیسہ اخبار کے ساتھ آپ نے گوجرانوالہ سے ایک ماہنامہ ''زمیندار و باغبان وبیطار،، جاری کیا جو ڈسٹرکٹ بورڈوں میں بیحد مقبول ہوا۔ اسی رسالہ نے بعد میں مولوی ظفر علی خاں کے والد منشی سراج الدین احمد کو روزنامہ زمیندار جاری کرنے کی ترغیب دی جس کے نام پر کچھ عرصہ دونوں

میں جھگڑا بھی چلا مگر دوستوں نے بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کرادی۔

۱۸۸۹ء میں اس خیال سے کہ لاہور میں اخبار گوجرانوالہ سے زیادہ ترقی کرسکتا ہے، مولوی محبوب عالم پھر لاہور چلے آئے۔ لاہور ہی کو مستقل وطن بنا لیا۔ یہیں کاروبار کو ترقی دی اور وفات کے بعد بھی اسی جگہ دفن ہوئے۔

جب تک مولوی محبوب عالم گوجرانوالہ میں تھے، آپ کانگریس کے زبردست حامی تھے۔ لاہور آکر بھی آپ کچھ عرصہ اسی حکمت عملی پر قائم رہے مگر جب آپ نے دیکھا کہ کانگریس میں ہندوؤں کا غلبہ ہے اور مسلمانوں کے حقوق ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں، تو آپ نے کانگریس کے مقاصد سے قطع تعلق کرکے مسلمانوں کی ترجمانی و حمایت شروع کردی۔ پھر بھی آپ کی معتدل اور مرنجان مرنج پالیسی کی وجہ سے سارا پریس آپ کا احترام کرتا تھا اور آپ ہندو مسلمانوں میں یکساں ہردلعزیز تھے۔ البتہ کبھی کبھی معاصرانہ چشمک کی وجہ سے تلخی سی ہو جاتی تھی مگر یہ عارضی ہوتی تھی جو آناً فاناً پیدا ہوتی اور چشم زدن میں مٹ جاتی تھی۔

۱۶ مارچ ۱۸۹۸ء سے مولوی صاحب نے ہفتہ وار پیسہ اخبار کا ایک روزانہ ایڈیشن جاری کیا جس نے بہت سے ملکی اور قومی معاملات پر روشنی ڈالی مگر لوگ چونکہ اس وقت روزانہ اخبار کی قدر و قیمت سے واقف نہ تھے، اس لئے ۲ مئی ۱۸۹۹ء کو روزانہ ایڈیشن بند کردیا گیا۔

۱۹۰۴ء میں آپ نے پھر روزانہ پیسہ اخبار کا سلسلہ شروع کیا۔ اس مرتبہ اخبار بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۰۷ء کے پر آشوب زمانے میں جب سودیشی اور سوراج کی تحریک بڑے زوروں پر تھی، پیسہ اخبار نے اپنی سلامت روی اور مستقل مزاجی سے مسلمانوں کو جادۂ اعتدال سے ہٹنے نہ دیا۔ آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پیسہ اخبار کی اشاعت اتنی بڑھ گئی کہ بارہ دستی پریس بھی بمشکل وقت پر چھاپ سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ولایت سے چھاپے کی مشینیں منگوائیں اور پریس کو خادم التعلیم اسٹیم پریس بنادیا۔

پیسہ اخبار ہی کے ذریعے ہمیں یہ بات پہلی مرتبہ معلوم ہوئی کہ ۱۹۰۱ء میں اقبال نے ای اے سی کے امتحان میں شرکت کا ارادہ کیا مگر عین امتحان سے ایک روز قبل طبی معائنہ کے وقت غالباً ضعف بینائی کی بنا پر ڈاکٹروں نے آپ کا نام فہرست امیدواران سے خارج کردیا۔ اس پر ستمبر ۱۹۰۱ء

کی کسی اشاعت میں پیسہ اخبار نے اور اکتوبر ۱۹۰۱ء کے کشمیری گزٹ میں منشی محمد الدین فوق نے میڈیکل بورڈ کے خلاف نہایت زور دار مضامین لکھے جن کے اقتباسات حسب ذیل ہیں :—

''پنجاب کے امتحان مقابلہ میں ایک کشمیری مسلمان،،

''بزرگان قوم سے مخفی نہیں کہ قوم میں کیسے کیسے لائق اور ہونہار نوجوان موجود ہیں جن سے قوم کو فخر قوم ہونے کی توقع اور امید ہے۔ منجملہ اور بہت سے نوجوانوں کے اس وقت شیخ محمد اقبال ایم اے جو اپنی بے نظیر لیاقتوں کے باعث چند ہی دنوں میں بہت شہرت حاصل کر چکے ہیں پنجاب کے امتحان مقابلہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر میں شامل ہوئے تھے۔ اس مقابلہ کے امتحان میں وہ چیز جس سے باوجود دلسوزی، قابلیت اور علمیت کے ناکامی کا نہایت ہی خطرہ ہوتا ہے، یہ ہے کہ امتحان سے ایک روز قبل میڈیکل بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے امیدواروں کی صحت کا معائنہ کرتا ہے اور جس کی صحت میں اسے شک ہوتا ہے، اسے امتحان کے ناقابل قرار دے کر امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیتا ہے۔ امسال بھی دو امیدوار، ایک ہندو اور ایک مسلمان (محمد اقبال صاحب ایم اے) اسی طبی معائنے کی نذر ہوئے ہیں۔

''معزز ہمعصر پیسہ اخبار سچ اور بہت سچ لکھتا ہے اور میری رائے میں ہمعصر کی یہ قابل وقعت رائے اس قابل ہے کہ پنجاب کے تمام اخبار اس کی تقلید کرکے پر زور مضامین لکھیں،، ہمعصر (پیسہ اخبار) کی رائے ذیل میں درج کی جاتی ہے :—
''پنجاب کے امتحان مقابلہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امیدواروں کی مصیبتوں میں یہ سب سے بھاری اور دردناک ہے کہ امتحان سے ایک روز پہلے میڈیکل بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے امیدواروں کی صحت کا معائنہ کرتا ہے اور جس کی صحت میں اسے شک ہوتا ہے، اسے ناقابل امتحان قرار دے کر نکال دیتا ہے۔ اس ہفتہ میں جو امیدوار طبی لحاظ سے خارج کئے گئے ہیں، ان میں ایک شیخ محمد اقبال ایم اے بھی ہیں۔ ان کی صحت ایسی اچھی ہے کہ جس میں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔

لیکن ڈاکٹروں کے فیصلے کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ بجائے اس کے کہ امتحان کی تیاری کر لینے کے بعد ان کا ڈاکٹری امتحان لیا جائے، نہایت بہتر ہو کہ امتحان کی تیاری کرنے سے پہلے ایسے امیدواروں کی جسمانی صحت کا امتحان کرکے انہیں خارج کردیا جائے۔ موجودہ صورت میں جب کہ وہ امتحان کے لئے محنت شاقہ اور صرف کثیر اٹھا کر تیاری کر لیتے ہیں، انہیں آخری وقت میں جواب ملنا کس قدر روحانی تکلیف کا باعث ہوتا ہوگا،، ؟ ۱

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اسی ناکامی کے بعد اقبال کے دل میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے ترقی کرنے کا خیال پیدا ہوا اور آپ اللہ کا نام لے کر اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی کفالت پر ۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو عازم انگلستان ہوئے جہاں سے پی۔ایچ۔ڈی اور بیرسٹری کی سند لیکر واپس آئے۔

۱۹۱۰ء میں ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ شیخ یعقوب علی تراب کے اخبار الحکم قادیان مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۱۰ء میں ایک خبر چھپی کہ آپ کی نواسی کا نکاح بعد از نماز مغرب پانچ سو روپیہ حق مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس بیسیوں خطوط استفسار کے آئے۔ اور کئی دوستوں نے زبانی بھی شکایت کی کہ ہمیں اس موقعہ پر کیوں یاد نہ کیا۔ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب پہلے ہی قادیانی (احمدی) ہوچکے تھے۔ اس لئے اس خبر کو صحیح تسلیم کرنے کے وجوہ موجود تھے۔ خود اقبال پر بھی ڈورے ڈالے جا چکے تھے جس کے ثبوت میں ایک منظوم خط بھی ملتا ہے جو ''پیغام بیعت کے جواب میں،، کے عنوان سے مئی ۱۹۰۲ء کے مخزن اور ۱۱ جون ۱۹۰۲ء کے اخبار پنجہ' فولاد لاہور میں شائع ہوچکا ہے۔ چند شعر یہ ہیں —

خضر سے چھپ کے مر رہا ہوں میں
تشنہ کام مئے فنا ہوں میں
ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل
خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں
کانپ اٹھتا ہوں ذکر مرہم پر
وہ دل درد آشنا ہوں میں

---

۱ — کشمیری گزٹ ماہ اکتوبر ۱۹۰۱ء

تنکے چن چن کے باغ الفت کے
آشیانہ بنا رہا ہوں میں
کارواں سے نکل گیا آگے
مثل آوازۂ درا ہوں میں
دست واعظ سے آج بن کے نماز
کس ادا سے قضا ہوا ہوں میں
میں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر
رمز وحدت سے آشنا ہوں میں
پردۂ میم میں رہے کوئی
اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں
ایک دانے پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو سیا سرا ہوں میں

اس خط کے چالیس شعر تھے۔ نظر ثانی میں ستائیس حذف کردئے گئے بانگ درا میں صرف تیرہ باقی رکھے اور عنوان بھی بدل کر ''عقل و دل،، کردیا [۱] اسی نظم کے جواب میں حامد سیالکوٹی نے ایک نظم الحکم میں چھپوائی تھی جس کا آخری شعر یہ تھا—

کیوں نہ ہو خاک پا مرا اقبال حامد نائب خدا ہوں میں

بہرحال چونکہ ڈاکٹر صاحب شادی شدہ بلکہ صاحب اولاد تھے۔ اس لئے ان کے رشتہ داروں کو تعجب بھی ہوا اور سخت صدمہ بھی پہنچا کہ ایک تو انہوں نے پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرا نکاح کرلیا (گو اس سے تعلقات اچھے نہ تھے) پھر قادیان جا کر قادیانیوں سے رشتہ ناطہ جوڑ لیا۔ آخر آپ کو اس کی تردید چھپوانی پڑی۔ چنانچہ آپ نے ۱۰ ستمبر کو ایک دستی چھٹی لکھی جو ۱۵ ستمبر کے روزنامہ پیسہ اخبار میں اس عنوان سے چھپی :—

''وہ ڈاکٹر محمد اقبال اور ہوں گے،،

اس میں اقبال نے لکھا :—

۱—سرود رفتہ صفحہ ۱۰۳

''مخدوم مکرم جناب ایڈیٹر صاحب پیسہ اخبار!

اسلام علیکم۔ مہربانی کرکے مندرجہ ذیل سطور اپنے اخبار میں درج فرما کر مجھے ممنون و مشکور فرمائیں۔

اخبار الحکم قادیان مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۱۰ء کے صفحہ ۱۳ پر مندرجہ ذیل خبر درج ہے :—

''بعد نماز عصر آپ کی نواسی کا نکاح ہونے والا تھا مگر مفتی فضل الرحمن صاحب کی وقتی غیر حاضری کی وجہ سے بعد نماز مغرب پانچسو روپیہ مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا''۔

اس عبارت سے میرے اکثر احباب کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے مجھ سے زبانی اور بذریعہ خطوط استفسار کیا ہے۔ سب حضرات کی آگاہی کے لئے بذریعہ آپ کے اخبار کے اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ جن ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا ذکر ایڈیٹر صاحب الحکم نے کیا ہے وہ کوئی اور صاحب ہوں گے۔ والسلام ۱۰ ستمبر ۱۹۱۰ء [۱]

آپ کا خادم

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لاء لاہور

مولوی محبوب عالم نے ۱۸۹۸ء میں ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار ''دی سن'' (THE SUN) جاری کیا جو دو سال بعد لوگوں کی ناقدری کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔

۱۸۹۸ء ہی میں مولوی صاحب نے ہفتہ وار ''انتخاب لاجواب'' جاری کیا جو آج تک اپنی نوعیت کا ایک ہی اخبار ہے۔ اس میں دلچسپ لطیفے، عجائبات عالم، شمار و اعداد، حکمت کے موتی، معلومات کا نچوڑ، سائنس کی ایجادات، نامور لوگوں کے با تصویر حالات اور دیگر صدہا قسم کے مفید مضامین شائع ہوتے تھے۔

---

۱ — روزنامہ پیسہ اخبار لاہور بابت ۱۵ ستمبر ۱۹۱۰ء۔ نیز اس موضوع پر میرا تفصیلی مضمون ''اقبال اور محمد اقبال'' ۲۲ اپریل ۵۳ء کے امروز لاہور میں ملاحظہ فرمائیں۔

مولوی محبوب عالم کو تعلیم نسواں کا بھی ابتدا ھی سے خیال تھا۔ اس خیال کو عملی صورت دینے کے لئے آپ نے ایک ماھوار رسالہ ''شریف بی بی'' لاھور سے جاری کیا جو ھندوستان میں اپنی طرز کا پہلا رسالہ تھا۔ ۱۸۹۵ء میں آپ نے پیسہ اخبار کا بھی ایک خاص نمبر شائع کیا جس میں جدت یہ تھی کہ تمام مضامین عورتوں کے لکھے ھوئے تھے۔ بعد میں یہ تمام مضامین ''ھندوستانی عورتوں کے مضامین'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ھوتے رھے۔

مولوی صاحب نے تعلیم نسواں کی تبلیغ ھی نہیں کی بلکہ اس پر خود عمل بھی کیا۔ آپ کی سب سے بڑی بیٹی فاطمہ بیگم نے تعلیم حاصل کی اور منشی فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ آپ غالباً پہلی مسلمان خاتون ھیں جنہوں نے یہ کڑی منزل طے کی اور طبقہ نسواں کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ فاطمہ بیگم نے کئی سال ھفتہ وار خاتون کی ادارت کی اور تحریک پاکستان میں بڑے جوش اور سرگرمی سے حصہ لیا۔ انہوں نے نواں کوٹ لاھور میں مسلمان لڑکیوں کے لئے فاطمہ جناح کالج قائم کیا جسے سیاسی مصروفیتوں کے سبب آپ پورا وقت نہ دے سکیں اور اسے ایک ٹرسٹ کی صورت دے کر ملت کے حوالے کرنا پڑا۔

مولوی صاحب کی دوسری لڑکی زینب نے فارسی میں ایم اے کیا۔ یہ غالباً دوسری مسلمان خاتون تھی جس نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

مئی ۱۹۰۰ء میں مولوی محبوب عالم پیرس کی نمائش دیکھنے، سیر و سیاحت کا لطف اٹھانے اور اخبار نویسی کا مطالعہ کرنے کے لئے یورپ روانہ ھوئے۔ ۲۵ مئی ۱۹۰۰ء کو جمعہ کے روز ساڑھے پانچ بجے شام اسلامیہ کالج لاھور کے وسیع صحن میں آپ کے دوستوں نے ایک شاندار الوداعی دعوت منعقد کی جس میں اقبال اور دیگر بزرگوں کے علاوہ مندرجہ ذیل اصحاب خاص طور پر شریک ھوئے :—

> ''خان بہادر محمد برکت علی خاں سیکریٹری انجمن اسلامیہ و وائس پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی۔ نواب شیخ غلام محبوب سبحانی رئیس لاھور۔ سردار رضا علی خاں قزلباس۔ خان بہادر ڈاکٹر سید امیر شاہ۔ فقیر سید افتخار الدین میر منشی گورنمنٹ پنجاب۔ میاں کریم بخش میونسپل کمشنر۔ مولوی محمد فضل الدین رئیس، پلیڈر و میونسپل کمشنر، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی صدر انجمن

حمایت اسلام۔ حاجی میر شمس الدین جنرل سیکریٹری انجمن حمایت اسلام۔ شیخ عمر بخش بیرسٹر ایٹ لا۔ خان صاحب ڈاکٹر مہتاب شاہ پروفیسر وٹرنری کالج۔ سید ولی شاہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر۔ مرزا نوازش علی ریڈر چیف کورٹ۔ سید احمد شاہ تحصیلدار۔ چوھدری نبی بخش وکیل۔ ماسٹر شیر محمد (میو سکول آف آرٹس) مولوی حاکم علی پرنسپل اسلامیہ کالج۔ سید خورشید انور وغیرہ،، [۱]

شیخ عبدالقادر ان دنوں انگریزی اخبار ابزرور کے ایڈیٹر تھے ان کی مختصر سی تقریر کے بعد خان احمد حسین خاں (مدیر شباب اردو لاھور) نے الوداعی نظم پڑھی اور مولوی محبوب عالم کی جوابی تقریر کے بعد جلسہ برخاست ھوا۔ مگر جب چند مخصوص احباب باقی رہ گئے تو اقبال نے مندرجہ ذیل نظم پڑھ کر سنائی جو ان کے اپنے مجموعہ کلام میں تو شامل نہیں البتہ مولوی محبوب عالم کے سفرنامہ یورپ میں طبع ھوچکی ھے —

لیجئے حاضر ھے مطلع رنگیں
جس پہ صدقے ھوں شاھد تحسیں

سوئے یورپ ھوئے وہ راہ سپر
مفت میں ھوگیا ستم ھم پر

آنکھ اپنی ھے اشک خونیں سے
غیرت کاسۂ مئے احمر

فتح ملک ھنر کو جاتے ھیں
ھمرکابی کو آرھی ھے ظفر

''تاڑ جاتے ھیں تاڑنے والے،،
کھینچ کر لے چلا ھے ذوق نظر

فخر انساں کا ھے تلاش کمال
جستجو چاھیئے مثال قمر

خوب تاڑا ھے سیر کا موقعہ
نکتہ بیں چاھیئے نگہ بشر

سیر دریا میں ھیں ھزار مزے
جس کو دکھلائے خالق اکبر

وہ سر شام بحر کی موجیں
مہر کی وہ خرام پانی پر

وہ سمندر بساط کی صورت
اور وہ موجوں کا کھیلنا چوسر

اور وہ چاندنی کہ بحر جسے
اوڑھ لیتا ھے صورت چادر

دی خبر آپ نے یہ کیا ناگہ
چپکے چپکے چبھو دیا نشتر

دوستوں کا فراق قاتل ھے
درد اٹھتا ھے صورت محشر

آنکھ میں ھیں نہیں رواں لیکن
اشک اپنے ھیں مثل آب گہر

---

۱ — سفر نامہ یورپ و بلاد روم و شام و مصر نوشتہ مولوی محبوب عالم صفحہ ۹ ۔

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۱۹۱

اقبال ریویو

مجلۂ اقبال اکادمی۔ پاکستان

جنوری ۱۹۶۳ء

مندرجات

اقبال اکادمی۔ پاکستان۔ کراچی

اقبال ریویو

مجلہ اقبال اکادمی پاکستان

جس کا مقصد ایسے مقالات پیش کرنا ہے جو اقبال کی زندگی، شاعری اور حکمت کے مطالعہ پر مشتمل ہوں، جو سیاسیات، اخلاقیات، تعلیم، تاریخ، معاشیات، فلسفہ، عمرانیات، نفسیات، ادب، فن، تقابل مذاہب اور اسلامیات وغیرہ پر اقبال کے افکار کی تشریح و توضیح کریں۔

بدل اشتراک

(چار شماروں کے لئے)

پاکستان	بیرونی ممالک
۸ روپیہ	۱ پونڈ

قیمت فی شمارہ

پاکستان	بیرونی ممالک
۲ روپیہ	۵ شلنگ

مضامین برائے اشاعت "مدیر اقبال ریویو

۸۳۔ پاکستان سیکریٹریٹ۔ کراچی" کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔

ناشر و طابع: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ڈائرکٹر، اقبال اکادمی پاکستان کراچی
مطبع: فیروزسنز پریس۔ کراچی

جانیے اور پھر کے آنیے گا | صورت بوئے نافۂ اذفر
اس طرح آنکھ راہ دیکھے گی | جوں مؤذن کو انتظار سحر
بزم یاراں رہے گی یوں خاموش | جیسے چپ چاپ شام کے ہوں شجر
سر مژگاں پہ آگئے آنسو | نکل آیا جو دل میں تھا مضمر
مدح احباب فرض انساں ہے | لاؤں اس کے لئے میں خامۂ زر
یاں خموشی گناہ ہے ایسی | جس طرح کفر ہجو پیغمبر

یہ حضر آپ کو مبارک ہو
یہ سفر آپ کو مبارک ہو

آپ ہیں محو سیر دریائی | چشم احباب غم سے بھر آئی
رقص موجوں کا جا کے دیکھیں گے | بھیج دی ہے جہاز کو سائی
لطف اخبار کا جب آتا ہے | بزم یورپ سے ہو شناسائی
دم رخصت وہ گرم جوشی ہے | آتش عشق جس سے شرمائی
کسی کونے میں تاکتی ہے اسے | گرمیٔ آفتاب جولائی
لب سے نکلا کہ "فی امان اللہ" | فخر کرتا ہے تاب گویائی
نشۂ دوستی چڑھا ایسا | شعر میں بھی ہے رنگ صہبائی
آپ آئینہ پر گرائے ہیں | "بسلامت روی و باز آئی"
عزم پنجاب ہو مگر جلدی | کہ نہیں طاقت شکیبائی
ہو نہ محبوب سے جدا کوئی | اے رگ جان عالم آرائی[1]
الغیاث اے معلم ثالث[2] | درد فرقت سے جان گھبرائی
ایسی پڑیا کوئی عنایت ہو | دل سے اٹھے کہ وہ شفا پائی
آگیا بحر چپ رہو اقبال | خامہ کرتا ہے عذر بے پائی
توبہ کر لی ہے شعر گوئی سے | اس کی قیمت پڑی نہ اک پائی
شعر سے بھاگتا ہوں میں کوسوں | ہے یہ توحید اور میں عیسائی
"آں چہ دانا کند، کند ناداں | لیک بعد از ہزار رسوائی"

دوستوں کی رہے دعا حافظ
ہو سفر میں ترا خدا حافظ

(سفر نامۂ یورپ ص ۱۷—۱۸)۔

---

۱ — اس شعر میں محبوب عالم نام لایا گیا ہے۔

۲ — معلم ثالث بوعلی سینا جو مشہور فلسفی اور طبیب تھے۔ یہاں ان کی طبابت کی طرف اشارہ ہے۔ معلم اول ارسطو اور معلم ثانی ابونصر فارابی۔

مولوی محبوب عالم اٹلی، آسٹریا، جرمنی، بلجیم، فرانس، انگلستان، روم و شام اور مصر کی سیاحت کے بعد دسمبر ۱۹۰۰ء میں واپس تشریف لائے آپ اردو زبان کے پہلے اخبار نویس ھیں جنہوں نے یورپ کے اخباری تجربات حاصل کرکے نہ صرف اپنے کاروبار کو توسیع و ترقی دی بلکہ ملک اور قوم کو بھی اس سے معتدبہ فائدہ پہنچایا۔ آپ کے کاروبار کی وسعت دیکھ کر محکمۂ ڈاک نے ۱۹۰۰ء میں پیسہ اخبار کے نام سے آپ کو الگ ڈاکخانہ دیا جو تقسیم ملک تک موجود تھا۔ واپسی پر آپ نے سفر نامۂ یورپ لکھا جو ملک میں بہت مقبول ہوا اور اس پر آپ کو محکمہ تعلیم کی طرف سے چار سو روپیہ کا انعام ملا۔

ولایت سے آکر ۱۹۰۲ء میں آپ نے بچوں کی دلچسپی اور مطالعہ کے لئے ایک ماہوار رسالہ ''بچوں کا اخبار،، جاری کیا جو بہت پسند کیا گیا اور اس جدت پر ایک خاص انعام بھی ملا۔

مولوی محبوب عالم اخبار نویس ہونے کے ساتھ ساتھ سینکڑوں کتابوں کے ناشر اور کئی کتابوں کے مصنف، مولف اور مترجم بھی تھے۔ آپ اردو، فارسی، عربی، انگریزی کے علاوہ فرانسیسی، ترکی اور روسی زبان بھی جانتے تھے۔ جرمن زبان سے بھی تھوڑی بہت شد بد تھی۔ مطالعہ کا بیحد شوق تھا۔ انگریزی کے اخبار اور رسالے اکثر دیکھتے رہتے تھے اور جہاں انہیں کوئی بات دلچسپی بڑھانے والی نظر آتی تھی اسے اپنے اخبار میں شروع کردیتے تھے۔ آپ کے ذاتی کتب خانے میں اخلاق، تاریخ، مذھب اور علم و ادب کی ہزاروں کتابیں تھیں جن میں بعض بہت نایاب اور قیمتی تھیں۔ بعض ایسی بھی تھیں جو انہوں نے خاص ولایت سے منگوائی تھیں۔ یہ کتب خانہ ۲۰ جنوری ۱۹۱۴ء کی رات کو کارخانہ پیسہ اخبار میں آگ لگ جانے کی وجہ سے ضائع ہوگیا۔ مولوی صاحب ان دنوں ولایت کے سفر میں تھے۔ وہ ۳۰ جنوری کو اس سفر سے واپس آئے تو دل تھام کر رہ گئے۔ ان پر اس المناک حادثہ کا بڑا صدمہ ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ میری چالیس سال کی محنت کا نتیجہ تھا۔ اب ان کتابوں کا فراہم ہونا مشکل ھے۔ مگر ان کا شوق مطالعہ اور استقلال قابل داد تھا کہ آپ نے ایک دفعہ پھر کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر لیا جو آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے حوالے کردیا۔

منشی صاحب موزوں طبع بھی تھے۔ اگرچہ شعر کہنے کی انہیں فرصت

تھی نہ ضرورت مگر یہ خدا داد جوہر جب کبھی ظاہر ہونا چاہتا ہے تو کسی کے روکے نہیں رکتا۔ ایک دفعہ ان کے ایک شکاری دوست نے چار تلئیر تحفہ کے طور پر بھیجے۔ آپ نے شکریے میں چار شعر قلم برداشتہ لکھ دئے جن میں سے دو یہ ہیں:—

چار تلئیر جو آپ نے بھیجے
ان سے بندہ ہوا بہت محظوظ
اے شکاری تجھے خدا رکھے
جملہ آفات سے سدا محفوظ

پیسہ اخبار کا دفتر ہمیشہ اخبار نویسی سکھانے کا دبستان رہا ہے اور مولوی محبوب عالم کو عموماً ایڈیٹر گر کہا جاتا ہے۔ جس اردو اخبار کو متحدہ ہندوستان میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہونے کا فخر حاصل تھا یعنی روزنامہ ''ہندوستان،، اس کے ایڈیٹر بابو دینا ناتھ حافظ آبادی اسی پیسہ اخبار میں ملازم رہ کر کام سیکھ چکے تھے۔ مرزا علی حسین جو اخبار فتح المبین اور اخبار وقت کے مالک و اڈیٹر تھے وہ بھی فن اخبار نویسی یہیں سیکھتے رہے۔ مولوی عبدالرؤف صاحب، رافت بھوپالی جو زبدۃ الاخبار (مملوکہ حکیم غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور) کے ایڈیٹر تھے، وہ بھی کئی سال اسی اخبار میں کام کرتے رہے۔ منشی منورخاں ساغر اکبر آبادی جن کے خوان کرم سے ہندو اخبارات نعمت ہائے گونا گوں حاصل کرتے رہے، سب سے پہلے پیسہ اخبار ہی میں فن اخبار نویسی سیکھتے رہے۔ منشی احمد دین بی۔ اے مالک و ایڈیٹر اخبار غم خوار عالم بھی پیسہ اخبار ہی میں برسوں کام کرنے کے بعد اپنا ذاتی اخبار نکالنے کے قابل ہوئے۔ مولوی محمد عبداللہ منہاس جو اخبار وکیل امرتسر، اخبار حمایت اسلام لاہور، روزنامہ شہباز پشاور اور کئی دوسرے اخباروں کو کامیابی سے چلاتے رہے، وہ بھی ابتدا میں پیسہ اخبار ہی میں تھے۔ میر جالب دہلوی مدیر ہمت لکھنؤ، منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار کشمیری لاہور، منشی محمد دین خلیق (جو عرصہ تک اخبار ریلوے اینڈ انجنیئرنگ نیوز انگریزی و اردو لاہور نکالتے رہے) ابتدائی مشق اسی اخبار کے دفتر میں کرتے رہے۔ منشی انبا پرشاد صوفی مراد آبادی جو اپنی پرجوش تحریروں کے باعث خاص طور پر مشہور تھے، عرصہ تک پیسہ اخبار میں کام کرنے کے بعد اپنا اخبار جامع العلوم نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ شیخ یعقوب علی تراب ایڈیٹر الحکم قادیان کو بھی اسی اخبار کے دفتر میں آمد و رفت، رکھنے سے اخبار نویسی کا چسکہ پڑا تھا۔

پیسہ اخبار خاص التزام کے ساتھ نہ صرف عربی اور انگریزی بلکہ ھندی، مرھٹی، گجراتی اور گورمکھی اخبارات و رسائل کے ترجمے اور بعض مستقل کارآمد مضامین بھی شائع کرتا تھا۔ کئی اخباروں کا گزارہ ھی ان ترجموں پر تھا۔ مولوی شجاع اللہ خاں مدیر ملت لاھور، سید ظہور احمد وحشی شاھجہان پوری، پروفیسر محمد عباس ایم اے مصنف کتاب مشاھیر نسواں، جنہیں پنجاب یونیورسٹی کانووکیشن کے موقعہ پر چھ مختلف تمغے اور ایک سو روپیہ نقد انعام ملا تھا، وقتاً فوقتاً پیسہ اخبار میں مدیر و مترجم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

آج کل اکثر اخبارات اشتہاروں سے لبریز ھوتے ھیں مگر ایک زمانہ تھا کہ تاجر پیشہ لوگ صرف پیسہ اخبار ھی کو اشتہارات کے لئے پسند کرتے تھے۔ پیسہ اخبار نے اشتہارات کی آمدنی سے معقول فائدہ اٹھایا۔

مولوی محبوب عالم بڑے وسیع الاخلاق اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ ان کا فیض عام تھا۔ وہ اعتدال پسند تھے۔ پر جوش، سنسنی خیز اور تہلکہ مچا دینے والے مضامین سے آپ کو نفرت تھی۔ سرکار دربار میں ان کی عزت تھی۔ ۱۹۰۳ء کے دھلی دربار میں جو لارڈ کرزن وائسرائے و گورنر جنرل کے عہد میں منعقد ھوا تھا آپ شاھی مہمانوں میں بلائے گئے ۔۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کے دربار دھلی میں بھی (جس میں خود شہنشاہ جارج پنجم تشریف لائے تھے) آپ مدعو تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں مولوی محبوب عالم کو سرکاری مہمان کی حیثیت سے پنجاب پریس کا نمائندہ منتخب کرکے ھندوستان کے آٹھ مدیران اخبار کے وفد کے ھمراہ، جس میں چار انگریز اور چار ھندوستانی تھے، عراق عرب کی سیاحت کو بھیجا گیا جہاں آپ نے بصرہ، عمارہ اور بغداد کے عام حالات اور جنگی تیاریوں کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس سفر کے لئے آپ ۱۷ مارچ کو روانہ ھوئے اور مئی ۱۹۱۷ء کے وسط میں واپس آئے۔ اپنے مشاھدات آپ نے نہایت تفصیل سے اردو میں قلم بند کئے جو سفرنامہ' بغداد کی صورت میں شائع ھوئے۔ یہ سفرنامہ پہلی بار بصورت کتاب ۱۹۲۱ء میں طبع ھوا۔

۱۹۱۸ء کے آخر میں انگلستان کی وزارت معلومات کی دعوت پر مدیران وفد کے ھمراہ آپ پنجاب کی طرف سے پھر انگلستان گئے۔ وھاں منجملہ دیگر اعزازات کے آپ کو حضور ملک معظم نے شرف باریابی عطا کیا۔ اس سفر سے

آپ ۱۷ جنوری ۱۹۱۹ء کو لاھور واپس آئے جہاں آپ کا شاندار استقبال ھوا۔ استقبال کرنے والوں میں وکیل، بیرسٹر، رؤسا، وائسیریگل کونسل کے ممبر اور اخبارات کے ایڈیٹر شامل تھے۔

مولوی محبوب عالم کو سیر و سیاحت طبعاً پسند تھی۔ چنانچه جب آپ بوڑھے ھوکر دور دراز سفر کے قابل نه رھے تو ھر سال کشمیر جایا کرتے تھے اور وھاں بھی کسی نه کسی رنگ میں ملت کی خدمت کرتے رھتے تھے۔

اب پیسه اخبار اور انتخاب لاجواب دونوں بند ھو چکے ھیں۔ البته پیسه اخبار کی عالی شان عمارات اب تک اس کا نام زندہ رکھنے کو موجود ھیں اور انار کلی کے جس حصے میں یه واقع ھیں، اس کا نام بھی ''پیسه اخبار اسٹریٹ،، ھی ھے۔

مولوی صاحب کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو ھوا اور آپ لاھور کے قبرستان میانی صاحب میں دفن کئے گئے آپ کے جنازے میں سر میاں محمد شفیع، سر فضل حسین اور علامه اقبال بھی شریک تھے۔ اقبال نے تعلق خاطر کی بنا پر حسب ذیل قطعه تاریخ کہا جو آپ کے سنگ مزار پر کندہ ھے۔

سحرگاھاں بگورستاں رسیدم — دراں گورے پر از انوار دیدم
ز ھاتف سال تاریخش شنیدم — معلی تربت محبوب عالم
۱۳۵۱ھ

اقبال کے کلام میں موضوع اور هیئت کی هم آهنگی

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

ایک زمانہ تھا کہ شعر کو نزول وحی سے تعبیر کیا جاتا تھا، لوگ شاعر کو تلمیذ رحمن اور خود شعرا اپنے ''حریر خامہ'' کو ''نوائے سروش'' سمجھتے تھے۔ اسی تصور شعر سے آمد اور آورد کی تفریق پیدا ہوئی تھی اور اچھے اور برے شعر کا امتیازی تجزیہ ناپختہ اور بے رہرو کاوشوں کا باعث بن گیا تھا۔

علم اور فن اور ادب شعوری کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اقبال کے یہاں فنکارانہ شعور کی بڑی فراوانی ہے۔ وہ ایک مفکر بھی ہے اور فنکار بھی۔ اس کے کلام میں عمیق فکر اور دقیق فن کی دل آویز آمیزش ہے اس کا سب سے بڑا کمال یہی نہیں کہ وہ ایک فلسفی ہے اور اس نے دنیا کو نئی حکمت زندگی سے روشناس کرایا ہے بلکہ اس کی عظمت اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ حکیمانہ افکار شعر کے حسین اور رنگین پیرائے سے آراستہ کرتا ہے۔ وہ ایک مفکر فنکار ہے ایک عظیم شاعر وہ لاکھ کہے کہ مجھے شاعر نہ کہو، میں غزل گو نہیں۔ 'نہ زبان کوئی غزل کی، نہ غزل سے آشنا میں،

ہر چند کہے نہیں مگر ہے۔

وہ شعر کے محاسن سے آشنا ہے۔ وہ غزل کی فنی نزاکتوں کو خوب بھانپتا اور سمجھتا ہے۔ اسی چیز کا سرسری تجزیہ ہمارے اس مقالے کا موضوع ہے۔

موضوع سخن سے مراد بنیادی خیال ہی نہیں بلکہ شاعر کا موضوع کی طرف انداز رجحان بھی اس میں شامل ہوتا ہے اس میں شاعر کے مخصوص نقطۂ نظر کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے اور اگر وہ نقطۂ نظر افادی ہے تو یہ بھی دیکھنا لازمی ہے کہ شاعر کے سامعین کون لوگ ہیں۔

اقبال کی چند ابتدائی غزلوں اور نظموں کو چھوڑ کر اس کے باقی کلام میں یہ عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ بادی النظر میں ہمیں اقبال کے ہاں کوئی بنیادی لسانی اور عروضی تبدیلیاں نہیں ملتی۔ بظاہر اس نے پرانی اصناف سخن غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ سے کام لیا ہے اور پرانے اوزان

اور بحریں استعمال کی ہیں ان کا کلام قدیم عروضی نظام میں سمویا ہوا نظر آتا ہے لیکن عروض کا تعلق اوزان سے ہوتا ہے۔ اوزان کا تنوع اور ان کے زحافات، موسیقی کے زیر وبم سے مربوط ہوتے ہیں۔ اسی سے مختلف اصناف سخن وجود میں آتی ہیں۔

ہر صنف شعر اور ہر وزن محض نظم یا غزل کی ہیئیت کو ترتیب نہیں دیتا بلکہ اس کی اپنی ایک انفرادی حیثیت بھی ہوتی ہے جو نفس مضمون کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر اجاگر ہوتی ہے اور خود موضوع سخن کو چمکاتی ہے۔

اصناف سخن میں مثنوی کی صنف کو عام طور پر کسی طویل موضوع کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے اور اس کے لئے سادہ اور چھوٹی بحر انتخاب کی جاتی ہے چنانچہ فارسی میں اسرار و رموز دونوں طویل نظمیں، مثنوی میں ہیں اور ان کی بحر بھی چھوٹی ہے لیکن اقبال کی ایک مختصر نظم ''ایک شام،، اور ''والدۂ مرحومہ کی یاد میں،، جو نسبتاً لمبی ہے مثنوی میں ہے اور ایک کی بحر چھوٹی اور دوسری کی طویل ہے۔ ان کی طویل نظموں میں شکوہ مسدس میں ہے، مسجد قرطبہ ترکیب بند ہے اور ساقی نامہ مثنوی۔ آخر یہ تباین کیوں ہے؟ کیا یہ تباین محض تنوع برائے تنوع کے لئے تھا۔ نہیں۔ ان نظموں کے بنیادی خیال الگ الگ ہیں۔ ہر نظم میں شاعر کا موضوع کی طرف رحجان کا انداز الگ ہے۔ اس کا زاویۂ نگاہ جداگانہ ہے اس کے سامعین مختلف ہیں، یوں کہئے کہ ہر نظم کا مزاج الگ ہے اور شاعر نے اسی مزاج کے مطابق صنف شعر اور پھر اس صنف شعر کے لئے بحر، انتخاب کی ہے۔

''شکوہ،، ایک بچے کی فریاد ہے جو کبھی جائز اور کبھی ناجائز طریق پہ روتا ہے اور ہنگامہ بپا کرتا ہے۔ اس کی چیخ پکر کے تقاضوں میں کوئی منطقی ربط یا جذباتی تسلسل نہیں ہوتا وہ اپنے شور اور غوغا سے محض بڑوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرانا اور اپنی بیچارگی کو منوانا چاہتا ہے۔ مسدس کے چھ مصرعی بند، بچے کی فریاد کے بے ربط سے ٹکڑے ہیں جنہیں وہ بغیر کسی التزام کے جوڑتا چلا جاتا ہے۔

اس کے برعکس ان کی نظم ''والدۂ مرحومہ کی یاد میں،، ایک کہن سال، تجربہ کار، جہاں دیدہ، مفکر بزرگ کی دبی ہوئی رکی رکی سی فریاد ہے اس لئے کہ

علم و حکمت رہزن سامان اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دل آگاہ ہے

لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس نظم میں مرثیے کی سی اثر انگیزی نہیں۔ یہ ایک بوڑھے انسان کی ہلکی سی آہ ہے جو بچے کی چیخ پکار سے کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے۔ ''والدہ مرحومہ کی یاد،، میں صرف اقبال کی والدہ کی یاد ہی پوشیدہ نہیں بلکہ ہر ذکی الحس انسان کی والدہ کی یاد سموئی ہوئی ہے۔ بچے کی فریاد سے بچے کی ماں چونک اٹھتی ہے۔ اس خاموش فریاد سے دنیا کے دل لرز جاتے ہیں۔ اس نظم کا تاثر ہمہ گیر ہے۔ اس میں آفاقیت ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا یہ نظم مثنوی میں ہے اور اس کی بحر لمبی ہے مثنوی سے اس نظم کے خیالات میں تسلسل اور روانی ابھرتی ہے اور اس کی لمبی بحر سے باتیں کرنے والے کی ثقاھت طبع کا پتا چلتا ہے۔

ھمارا نظریہ اقبال کی ایک فارسی نظم سے زیادہ واضح ھوسکے گا۔ وہ نظم ''تسخیر فطرت،، ہے۔ اس نظم کو شاعر نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ میلاد آدم۔ انکار ابلیس۔ اغوائے آدم۔ اخراج آدم از بہشت۔ اور صبح قیامت۔ نظم ایک ہے۔ خیالات مسلسل اور مربوط ھیں لیکن نظم کے ہر حصے کی ھیئت الگ الگ ہے۔ پہلے بند کا آغاز یوں ھوتا ھے

نعرہ زد عشق کہ خونین جگرے پیدا شد　　حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان خاموش　　خود گرے، خود شکنے، خودنگرے پیداشد

''میلاد آدم،، ایک ھنگامہ آفرین حادثہ تھا۔ شاعر اس ھنگامے کا اعلان بڑے طمطراق سے کرتا ہے۔ اس بند کی بحر، اشعار کا اندرونی ترنم، اس کے قواق اور ردیف وھی اثر انگیزی پیدا کر رہے ھیں۔

دوسرے دو بندوں میں ابلیس کا ذکر ہے جو اس ھنگامے کو دیکھتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ھوتا۔ وہ بڑی متانت اور رعونت سے آدم کا خیر مقدم اور اس کی عظمت سے انکار کرتا ہے اور پھر اسے پھسلانے اور بہکانے کے لئے بھی اسی متانت سے سرگرم عمل نظر آتا ہے۔ دیکھئے یہاں بحر اور بحر کے ساتھ طرز بیان کا لہجہ کیسے بدلتا ہے

نوری نادان نیم سجدہ بآدم برم　　او بنہاد است خاک من بہ نثراد آذرم
می تپد از سوز من خون رگ کائنات　　من بدو صرصرم ، من بفوتندرم

چوتھے بند میں آدم کے اس کائنات ارضی کی وسیع، دلکشا فضا میں سانس لینے کا تذکرہ ہے۔ شاعر نے یہاں نہ صرف بحر کو بدلا ہے بلکہ صنف شعر کو

بھی بدل دیا ہے۔ یہ بند ایک غزل ہے جس کا لہجہ طربیہ ہے۔ لفظوں سے نشاط انگیزی ٹپک رہی ہے۔

چه خوش است زندگی را همه سوز و ساز کردن
دل کوه و دشت و صحرا به می گداز کردن
ز قفس دری کشادن به فضاے گلستانی
ره آسمان نوردن به ستاره ساز کردن

شاعر اس نظم کے آخری بند میں آدم کو خدا کے حضور میں دکھاتا ہے جہاں وہ اپنی انسانی عظمت کو بیان کرتا ہے لیکن نہایت عجز و احترام کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس کے طرز بیان میں طمطراق نہیں انکسار ہے۔ لجاجت ہے۔ چنانچہ اشعار کا لہجہ بھی اسی کے مطابق بدلتا ہے۔

ے که ز خورشید تو کوکب من مستنیز
از دلم افروختی شمع جهان ضریر
گرچه فسونش مرا برد ز راه صواب
از غلطم در گذر، عذر گناهم پذیر

اس بند کے اشعار کے اخیر میں قافیہ اور ردیف کی جگہ صرف روی سے کام لیا گیا ہے۔ اس روی کے الفاظ مستنیز، ضریر، پذیر کی آواز عمودی نہیں افقی ہے جو بات کرنے والے کی لجاجت طبع کو ظاہر کرتی ہے۔

اب ہم اقبال کی دو کامیاب اور مشہور نظموں مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ کو لیتے ہیں اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس تجزیے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ اقبال کے یہاں موضوع اور ہیئت میں کس قدر گہرا ربط ہے۔

مسجد قرطبہ کا عنوان وہی حیثیت رکھتا ہے جو اقبال کے کلام میں دوسری نظموں مثلاً ''بلال،، کناری راوی، یا موٹر۔ شاعر نے اس نظم میں مسجد قرطبہ کی تاریخ بیان نہیں کی، اس کے فنی اور تعمیری محاسن کا جائزہ نہیں لیا۔ نظم ''صقلیہ،، کی طرح اس نے قدیم حجازی تہذیب کے مٹتے ہوئے آثار پر آنسو نہیں بہائے۔ یہ عنوان محض ایک شعری علامت ہے۔ ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد شاعر نے اپنے خیالات کی دنیا تعمیر کی ہے اور اپنے جذبات کی باز آفرینی دکھائی ہے۔ یہ ایک کنایہ ہے جو اس کے شاعرانہ احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

''مسجد قرطبہ،، کی علامت میں تقدس کا پہلو پوشیدہ ہے ۔ وہ فن تعمیر کا ایک شاہکار بھی ہے اور عہد ماضی کی شاندار روایات کی یادگار بھی۔ چنانچہ شاعر نے ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، نظم کے لئے ترکیب بند کی صنف انتخاب کی ہے ۔ ایک بند سے دوسرے بند تک پہنچنے کے لئے وہ بڑے سکون اور احترام سے چلتا ہے ۔ بحر کی طوالت شاعر کی ذہنی کیفیت کی آہستہ خرامی کو ظاہر کرتی ہے ۔

شاعر نے نظم کی ابتدا یوں کی ہے

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات — سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز شب ساز ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیرو بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ،مجھ کو پرکھتا ہے یہ — سلسلۂ روز شب، صیر فی کائنات

یہ بحر مفتعلن فاعلن، مفتعلن فاعلات ہے ۔ یہ بحر اگرچہ نئی نہیں تاہم اردو شاعری کے مروجہ ور متداول بحروں سے الگ تھلگ ضرور ہے ۔ یہ انتخاب، شاعر کا غیر شعوری عمل نہیں، ارادی اور اختیاری تصرف ہے اس لئے کہ اس بحر کی رفتار موضوع کی ثقاہت اور جذبات کے شدید مگر منضبط اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ اس بحر کے ارکان میں باھمی توازن ہے ۔ اس سے اشعار میں ایک اندرونی ترنم پیدا ہوگیا ہے جو قافیہ اور ردیف کے نہ ہونے کی تلافی کرتا ہے کیونکہ اس نظم کے اشعار میں قافیہ اور ردیف کی جگہ فقط روی کا استعمال ہوا ہے ۔

اس نظم میں عربی اور فارسی کے پرشکوہ اور قدرے غیر مانوس الفاظ استعمال کئے گئے ہیں مثلاً صیرفی کائنات ۔ کاس الکرام ۔ ابن السبیل ۔ بادۂ رحیق ثغور ۔ تیغ اصیل ۔ شبوں کا گداز ۔ مگر ان لفظوں کی نشست شعروں میں اس طرح حسین واقع ہوئی ہے جیسے کسی عظیم الشان عمارت میں بڑے بھاری پتھروں کے ٹکڑے لطیف انداز میں جڑے ہوتے ہیں اور اپنی عظمت کے ساتھ ساتھ شاہپارہ فن میں لطافت پیدا کرتے ہیں ۔ اس نظم کی اہم خصوصیت اس کا مترنم پن ہے ۔ یہ ترنم آمیز لہجہ شروع سے اخیر تک چلا جاتا ہے ۔ رستے میں مختلف النوع منزلیں آتی ہیں ۔ وقت کی رو ۔ بندۂ مومن، نظریۂ فن، اندلس کی فضائے حسین میں عالم نو کے معرض وجود میں آنے کے امکانات، لیکن ساری نظم، ایک خاموش قافلے کی طرح چلی جاتی ہے جس کے ہر راہی کا قدم ایک ہی نہج پر پڑتا ہے اور ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہے ۔

الفاظ کی اجنبیت اور ثقالت اس روانی میں حارج نہیں ہوتی ۔ اس لئے کہ وہ الفاظ معنوی اشارے نہیں بلکہ احساساتی محرکات ہیں جن سے جذبات خود بخود ابھرتے چلے جاتے ہیں ۔

چند شعر سنئے : —

شاعر مسجد سے خطاب کرتا ہے

کعبۂ ارباب فن، سطوت دین مبین
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمین
آہ وہ مردان حق، وہ عربی شہسوار
حامل خلق عظیم صاحب صدق و یقین
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنت اہل دل، فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوشدل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں

اس نظم کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس مسجد کے ساتھ ساتھ ایک اور مسجد فضا میں تعمیر ہورہی ہے جس کی بنیادیں سنگ و خشت پر نہیں بلکہ انسان کے غیر فانی احساسات پر استوار کی گئی ہیں ۔

ساقی نامہ اور مسجد قرطبہ دونوں نظموں کا بنیادی خیال ایک ہے لیکن موضوع الگ الگ ہے ۔ ساقی نامہ موضوع کے اعتبار سے مسجد قرطبہ کی ہم سخن ہے، ہمنوا نہیں ۔ اس کی لے اور مسجد قرطبہ کی لے میں وہی فرق ہے جو خود ان نظموں کے عنوانوں میں ہے ۔ ایک طرف ایک نظم کا موضوع تاریخ، تقدیس اور فنون کا پس منظر پیش کرتا ہے اور دوسری طرف دوسرا موضوع، خرابات اور طرب و انبساط کا پہلو لئے ہوئے ہے ۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے طرب و انبساط کی فضا میں اپنے متین خیالات کو اس طرح سمویا ہے کہ نظم کے نفس مضمون اور زبان و بیان میں مغائرت نہیں رہتی ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے شاعر نے بہت سے فنی وسائل استعمال کئے ہیں۔

(۱) ہلکی پھلکی بحر جو بحر متقارب مثمن محذوف و مقصور ہے

(۲) مثنوی کی صنف جس سے اسلوب بیان کی سادگی بدستور قائم رہتی ہے اور کہیں ثقالت پیدا نہیں ہوتی۔

(۳) روی اور قافیہ ردیف کا بدلتا ہوا امتزاج تا کہ مثنوی کے اشعار کی یکسانیت دور ہوسکے

ہوا خیمہ زن کاروان بہار — ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن — شہید ازل، لالہ خو نیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں

یا

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب — مگر لذت شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد — محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

دیکھئے شاعر نے روی اور ردیف کے متبادل تکرار سے نظم کے اتار چڑھاؤ کو کس طرح قائم رکھا ہے۔

اس نظم کی سادگی بیان کے ساتھ ساتھ اس میں اختصار و ایجاز بھی ہے چند اشعار سنیئے۔ ہر شعر ایک نظم معلوم ہوتا ہے :۔

جہاں چھپ گیا پردہ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں
تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتان عجم کے پجاری تمام
گیا دور سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا
مری فطرت آئینہ روزگار — غزالان افکار کا مرغزار
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

باوجود اس کے کہ نظم کا مضمون جگہ جگہ پہلو بدلتا چلا جا رہا ہے نظم کی کیفیاتی ہم آہنگی میں کہیں فرق نہیں آتا۔ اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے اس طرح جذباتی طور پر پیوست ہیں کہ ساری نظم ایک کیفیاتی

تجربہ بن گئی ہے ۔ اس نظم میں شاعر الفاظ کی ترکیبات، تشبیہات و استعارات، تلمیحات اور علامات بھی موضوع کے مطابق لایا ہے :—

کاروان بہار۔ دامن کوھسار۔ آشیاں ۔ طیور۔ ساق لالہ فام ۔ لذت شوق ۔ گردش جام ۔ خلوت و انجمن ۔ غزالان افکار۔ مرغزار۔ انجمن آفرین و خلوت نشین ۔

پھر شاعر نے ھندی الفاظ کو فارسی الفاظ کے ساتھ لا کر ایک حسین لسانی توازن بھی پیدا کیا ہے تاکہ ساقی نامے کی فضا قائم رہے ۔

اقبال کے کلام میں نظموں کے علاوہ، غزلوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے ۔ غزل کا ہر شعر الگ الگ ھوتا ہے ۔ اقبال جیسے فلسفی کے لئے جس کا دل و دماغ ایک منطقی کی طرح سوچتا ہے اور بیان میں تعین اور صراحت چاھتا ہے غزل کی صنف اور اس کا اسلوب بیان موزوں نہ تھا ۔ لیکن اقبال نے اپنی غزلوں میں تغزل یعنی رمز و ایما ۔ علامات و تلمیحات کے استعمال کے ساتھ ساتھ غزل کے اشعار میں جذباتی تسلسل پیدا کرکے اسے نظم کا رنگ دے دیا ۔

اس نے ان علامتوں اور تلمیحوں کی اپنی نئی بصیرتوں کی روشنی میں باز آفرینی کی ہے اور اس باز آفرینی سے شعری روایات کے مفہوم کو بدل دیا ہے ۔ وہ ہر غزل میں بنیادی خیال کے مزاج کے مطابق بحر بھی تلاش کرتا ہے ۔ یہاں صرف دو غزلوں کی مثالوں پر اکتفا کروں گا ۔

پہلی غزل ہے

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ھوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ھیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ھوں دانہ دانہ

اس غزل میں کیفیاتی تسلسل بہت مکمل ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اس غزل کا نظم کی طرح عنوان بھی رکھا ہے ۔ ''زمانہ،، اس غزل کی بحر لمبی ہے جس میں بحر متقارب مثمن مقبوض اثلم کے آٹھ ارکان کو سولہ کرکے لکھا ہے فعول و فعلن، فعول فعلن، فعول فعلن، فعول فعلن ۔ دو مصرعوں کو ایک مصرعہ بنادیا ہے ۔ اس بحر کے استعمال سے شاعر نے وقت کے پھیلاؤ

اس کے تواتر اور تسلسل اور اس طوالت کی کیفیت کا اظہار کیا ہے جو اس بحر کی موسیقیت سے خود بخود آشکار ہو جاتی ہے۔ قافیہ ردیف کی جگہ روی کو استعمال کیا ہے اور اس کی تلافی اندرونی ترنم سے کی ہے۔

دوسری غزل ہے۔

هر شے مسافر، هر چیز راهی — کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماهی
تو مرد میداں، تو میر لشکر — نوری حضوری تیرے سپاهی
دنیاے دوں کی کب تک غلامی — یا راهبی کر، یا بادشاهی
پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے — کردار بے سوز، گفتار واهی

اس غزل میں شاعر دنیا پر ایک اچکتی هوئی نظر ڈالتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا مشاهدہ تیزی کے ساتھ هر لمحہ ایک نیا پهلو بدلتا ہے۔ ان مختصر سے مشاهدات کو بیان کرنے کے لئے اس غزل کے لئے چھوٹی بحر استعمال کی ہے۔ تاکہ مشاهدوں کی تیزی نمایاں هو جائے۔ اور پھر شعروں کے اخیر میں لمبے اور ڈھلکتے هوئے قافیہ ردیف نہیں لایا تا کہ اس مختلف النوع مشاهدوں کا تواتر نہ ٹوٹ جائے اور ایک کے بعد دوسرا کیفیاتی تجربہ فوراً سامعین کے ذهن نشین هوسکے۔

غرض اقبال کے کلام میں شعری تصورات، حسین افکار اور حسین اسلوب دونوں کا حسین امتزاج هیں۔ اس کے نزدیک نظم کی هیئت فقط بحر اور قافیہ ردیف هی کا نام نہیں بلکہ اس میں، اندرونی ترنم، اسلوب بیان کا لہجہ، بنیادی خیال ہے، اس کی هم آهنگی سبھی کچھ شامل ہے۔

اقبال اور سیکولر ازم

بشیر احمد ڈار

لفظ سیکولر اپنے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں یورپ کے مذہبی ماحول کی پیداوار ہے ۔ عیسائی مذہب کی جو تشریح اور تعبیر پولوس نے کی اس میں چند اخلاقی اصول تو موجود تھے لیکن شریعت کی اس میں کوئی گنجائش نہ تھی ۔ اس زمانے کے مروجہ باطنی مذاہب اور اسرار میں یہ تصور موجود تھا کہ انسانی روح ایک پاکیزہ شے ہے جو بدقسمتی سے اس مادی دنیا کی قید میں اسیر ہوگئی ہے اس لئے انسان کا نصب العین یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے اس دنیاوی زندگی کی الائش سے اپنے آپ کو پاک رکھا جائے ۔ انہی تصورات کے زیر اثر پولوس نے حضرت عیسیٰ کی تعلیم کو اس طرح پیش کیا کہ گویا وہ بھی اسی مقصد کی خاطر اس دنیا میں آئے تھے ۔ چنانچہ پہلی دو تین صدیوں تک عیسائیوں کی کثیر تعداد اپنی انفرادی نجات کی کوششوں میں منہمک رہی ۔ معاشرتی اور تمدنی ذمہ داریاں ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں ۔ عیسائیت ایک نظام رہبانیت تھا جو اس ناپاک دنیا میں قائم کیا گیا اور جسکا مدنی امور میں کوئی دخل نہیں تھا ۔ چنانچہ جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے وہ ہر معاملے میں رومی حکومت کے زیر فرمان رہی۔ قسطنطین نے بادشاہ بننے کے بعد عیسائیت قبول کرلی اس نے کوشش کی کہ اس نئے مذہب کی بنیاد پر رومی سلطنت میں اتحاد و یگانگت پیدا کرسکے لیکن حقیقت میں عیسائیت بطور نظام اجتماع نہ اس وقت کارآمد ہے اور نہ اس وقت کارآمد ثابت ہوئی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قسطنطین کے جانشین جولین نے پھر سے دیوتا پرستی کی طرف رجوع کیا اور اسکی فلسفیانہ تاویلات سے لوگوں میں وحدت افکار و کردار پیدا کرنے کی کوشش کی۔

انہی قدیم باطنی اسرار اور عیسائیت کے تصورات کی آمیزش سے مانی نے اپنا فلسفہ حیات پیش کیا ۔ اس کی نمایاں خصوصیت جسم و روح ۔ مادیت و روحانیت، یزدان و اہرمن کی مطلق ثنویت ہے جن میں کسی قسم کا نقطہ اتصال موجود نہیں ۔ اس مانوی تحریک نے عیسائیت کے ارتقا پر بڑا اثر ڈالا ۔ اگستائن جس نے کلیسا کی ابتدائی تاریخ میں ایک موثر کردار ادا کیا ہے عیسائیت قبول کرنے سے پہلے مانوی مذہب ہی کا پیرو تھا ۔ محققین کا خیال

ہے کہ نور و ظلمت کی مانوی ثنویت کے افکار اس کے باعث عیسائیت میں رائج ہوئے۔ جیسا کہ اقبال نے خود ایک جگہ کہا ہے کہ ''مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ مانویت کے زیر اثر قبول کرلیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے نزدیک ذات انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزا ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جسکو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر ترک کر دینا چاہئے۔ اسلام کے نذدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔،،

خطبات میں فرماتے ہیں کہ ''اسلام نے روحانی اور مادے کی تفریق کبھی روا نہیں رکھی۔ کسی عمل کی ماہیت کا فیصلہ اس لحاظ سے نہیں کیا جاتا کہ اس کا تعلق کسی حد تک حیات دینوی یا سیکولر سے ہے بلکہ اس کا انحصار صاحب عمل کے ذہن رحجان پر ہے۔ اگر زندگی کی مقصدیت کو سامنے نہیں رکھا جاتا تو ہمارا عمل دینوی ہے اور اگر یہ مقصدیت ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں تو ہمارا عمل روحانی ہے ——— قرآن پاک کے نذدیک حقیقت مطلقہ محض روح ہے اور اسکی زندگی عبادت ہے اس فعالیت سے جس کو ہم زمانا جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ لہذا یہ طبیعی اور مادی اور دینوی ہی تو ہے جس میں روح کو اپنے اظہار کا موقع ملتا ہے اور اس لئے ہر وہ شے جسے اصطلاحاً سیکولر کہا جاتا ہے اپنی اصل میں روحانی تسلیم کی جائیگی۔،، (خطبات ۲۳۷-۲۳۹)

تن و جان را دوتا گفتن کلام است تن و جان را دوتا دیدن حرام است
بہ جان پوشیدہ امز کائنات است بدن حالے ز احوال حیات است

زندگی کے اس غلط نقطہ نظر کے باعث عیسائی مذہب میں شروع ہی سے کلیسا اور ریاست کے درمیان ایک قسم کا بعد اور تفریق پیدا ہوگئی۔ یہ صحیح ہے کہ کلیسائی اقتدار اور حاکمیت نے کافی عرصے تک یورپ کے مختلف ملکوں میں خالص دینی بنیاد پر اتحاد و یگانگت قائم رکھی لیکن لوتھر کی بغاوت سے یہ حالات یکسر بدل گئے۔ ہزار برائیوں کے باوجود کلیسائی اقتدار نے مذہبی اور اخلاق اقدار کو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نصب العین بنایا ہوا تھا۔ لوگ زندگی کے ہر پہلو کو مذہبی اور اخلاق نقطہ نگاہ کے مطابق ڈھالتے تھے۔ ان کی معاشرتی طرز زندگی ان کا اقتصادی

اور معاشی نظام سلطنتوں کے باھمی میل جول سبھی اخلاق اصولوں کی روشنی میں طے پاتے تھے ۔ لیکن لوتھر نے جب کلیسا کے خلاف آواز اٹھائی تو اس سے بہت سے دیگر نتائج کے علاوہ دو باتیں ھمیں خاص طور پر ظاھر ھوئیں ۔ پروٹسٹنٹ راھنماؤں نے مروجه مذھبی رسوم پر بڑی سخت تنقید کی ۔ ان کا موقف یه تھا که کلیسا کی حاکمیت کے زیر اثر افراد کی آزادی اور اختیار ختم ھوچکا ھے ۔ وہ مذھبی اور اخلاق معاملات کا فیصله کرنے کے مجاز نہیں ۔ آخری فیصله ھر معامله میں کلیسا کا ھوتا ھے ۔ اس کے خلاف ان راھنماؤں کا موقف یه تھا که اخلاق کا آخری معیار ھر انسان کا اپنا دل اور ضمیر ھے ۔ چنانچه اس کا نتیجه یه ھوا که مذھب کی سماجی اھمیت ختم ھوگئی ۔ ھر آدمی کو اجازت تھی که وہ اپنی داخلی زندگی میں مذھب سے وابستگی قائم رکھتے ھوئے زندگی کے دوسرے شعبوں میں جس طرح چاھیے عمل! کرے ۔ مذھب محض ایک شخص کا ذاتی معامله ھے اسکا کوئی تعلق اسکی باقی مانده زندگی سے کچھ نہیں اور نه ھونا چاھئے ۔ اس اصول کے تحت مذھب اور ریاست میں مکمل علیحدگی اور تفریق پیدا ھوگئی ۔ یه تفریق ایک معنی میں اسی فلسفیانه ثنویت کا منطقی نتیجه تھی جو مغربی حکماء نے بقول اقبال مانی کے زیر اثر اختیار کی تھی ۔

بدن را تا فرنگ از جان جدا دید   نگاہش ملک و دین راھم دو تا دید
کلیسا سبحه پطرس شمارد   که او با حاکمی کارے ندارد
به کار حاکمی مکر و فنے بین   تن بے جان و جان بے تنے بین

ملک و دین — ریاست اور مذھب مملکت اور اخلاق کی اس جدائی کا علمبردار میکیاولی تھا جس نے اپنی کتاب ''شہزادہ،، میں حکومت کے معاملات میں مذھب اور اخلاق کو برطرف کرکے خالص ابن الوقتی حکمت عملی کی تلقین کی۔ اس باطل پرست اطالوی مفکر کے نزدیک مملکت ھی ''معبود،، یعنی نصب العین ھے جس کی ضروریات کسی قانون اخلاق کے تابع نہیں

باطل از تعلیم او بالیدہ است   حیله اندوزی فنے گرویدہ است
شب بچشم اھل عالم چیرہ است   مصلحت تزویر را نامیدہ است

اس ''حیله اندوز،، اور پراز تزویر سیاست کو اقبال ''لا دین سیاست،، یعنی سیکولر ازم کا نام دیتا ھے ۔

مری نگاہ میں ھے یه سیاست لا دین   کنیز اھرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ھوئی ھے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد   فرنگیوں کی سیاست ھے دیو بے زنجیر

دین و اخلاق سے بے نیازی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو اپنی انفرادی زندگی میں اخلاق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور مذہب کے احکام کی پیروی کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے لیکن جب وہی افراد ریاست و حکومت کے معاملات اور بین الاقوامی مسائل پر غور و خوض شروع کرتے ہیں تو ہر قسم کے اخلاقی تقاضوں سے بے نیاز ہوکر فیصلہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی سیاست فساد فی الارض کا ایک بدترین سرچشمہ ہے۔ اگر اقتدار کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے ہاتھ میں ہو یا عوام کے ہاتھوں میں۔ جب بھی سیاست کو اخلاق سے علیحدہ رکھا جائیگا۔ تو اس سے فتنہ و فساد ہی پیدا ہوگا۔

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس چنگیزی کے باعث انسان کی تمدنی زندگی تباہی سے دو چار ہے۔ ہر قسم کی ترقی کے باوجود انسان اپنی زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہیں۔ معاشی زندگی میں استحصال و لوٹ، سماجی زندگی میں بے چینی اور خود غرضی، بین الاقوامی سطح پر باہمی بد اعتمادی، جنگ کی خوفناک تیاریاں یہ سب پریشان کن حالات اقبال کے خیال میں صرف سیکولر نقطہ نگاہ اختیار کرنے کا نتیجہ ہیں۔

یورپ از شمشیر خود بسمل افتاد — زیر گردون رسم لا دینی نہاد
گرگے اندر پوستین برہ — ہر زمان اندر کمین برہ
مشکلات حضرت انسان ازوست — آدمیت را غم پنہان ازوست

یہاں تک کہ وہ علم و تحقیق جو اقبال کے نزدیک انسانی خودی کے استحکام کے لئے ضروری ہے۔ اس لادین نقطہ نگاہ کے زیر اثر قومی خودی کی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ تسخیر کائنات کا مقصد انسان کو اس دنیا میں صحیح معنوں میں نائب حق کے منصب کا اہل بنانا تھا لیکن بدقسمتی سے اس سیکولر رجحان نے اس میں وہ زہر ملا دیا ہے جس کے باعث خود ''مارہا درپیچ و تاب،،

آہ علم اشیا خاکہ مارا کیمیا است — آہ در فرنگ تاثیرش جدا است
آہ از افرنگ و از آئین او — آہ از اندیشہ لا دین او
اے کہ جان ما باز می دانی زتن — سحر این تہذیب لا دین شکن

یہی علم خیر کثیر ہے اگر اس کا تعلق حق تعالے سے ہو۔ اگر دین و اخلاق کے سرچشمہ سے رابطہ موجود ہو تو یہ علم پیغمبری کے ہم پایہ ہے لیکن جب یہ علم سوز دل سے عادی ہو جائے اور حق سے بیگانگی کا مظہر ہو تو یہ بجائے خیر کثیر کے شر اعظم بن جاتا ہے جسکے فساد کی لپیٹ میں اس وقت ساری دنیا پھنسی ہوئی ہے۔ اس کا واحد علاج اقبال کی نگاہ میں لادینیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا ہے۔ انسانی زندگی میں سکون و اطمینان راحت و سعادت تبھی ممکن ہے کہ دین و دنیا کی دوئی ہمیشہ کے لئے ختم کردی جائے۔ اخلاق اور سیاست کی بے تعلقی کے باعث جو غیر متوازن حالات پیدا ہوئے ہیں اس کو اقبال نے بڑے عمدہ انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راھی میں کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذھب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جسدم جدائی ہوس کی اسیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کے لئے نامرادی دوئی جسم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا بشیری ہے آئینہ دار نزیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں اک جنبدی اردشیری

جب علم و قوت لادینی سے متاثر ہوں تو زہر ہلاھل سے زیادہ خوفناک ہیں لیکن جب یہی علم و قوت دین و اخلاق سے مربوط ہوں تو زہر کا تریاق اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ تیغ ایوبی اور نگاہ بایزید ایک ذات میں موجود ہونا ہی انسانیت کی بقا کا ضامن ہے۔ جب انسان اس نہ سپہر کے طلسم کو توڑ دیتا ہے لیکن اس کے نشیب و فراز، رنج و راحت سے متاثر نہیں ہوتا تبھی دنیا فساد و فتنہ سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

شکوہ خسروی ایں است ایں است ھمیں ملک است کوتوام بہ دیں است

لادینیت کا ایک دوسرا مظہر وطن کا غلط تصور ہے۔ بدقسمتی کہنا چاہئے کہ اس خطرناک نظریے کا آغاز بھی تحریک اصلاح کلیسا کے ہاتھوں ہوا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کلیسائی حاکمیت کے باعث تمام عیسائی ممالک ایک رشتہ اخوت میں منسلک تھے اور اس اتحاد و اخوت کی بنیاد مذہبی اور اخلاق یگانگت پر تھی۔ جب لوتھر نے کلیسا کے اس عالمگیر نظام کو ختم کردیا تو ہر ملک کو اپنی انفرایت قائم رکھنے کیلئے کسی نفسیاتی بنیاد کی ضرورت تھی یہ نفسیاتی بنیاد نظریہ وطن و نسل نے فراہم کیا۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ لوتھر کی یہ بغاوت درحقیقت جرمن قومیت کی سرفرازی کیلئے تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیح کے عالمگیر نظام اخلاق کی بجائے بے شمار اخلاق نظام وجود میں آئے۔ چنانچہ اہل مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر انسانی نصب العین سے ہٹ کر اقوام و عدل کی تنگ حدود میں الجھ کر رہ گئیں اس کے لئے انہیں وطنیت کے تصور سے زیادہ اور کوئی بہتر اساس میسر نہ آئی۔

وطنیت کی یہ اساس اپنے بنیادی مفہوم میں انسانی جماعت کی ہئیت کا ایک سیاسی اصول ہے۔ جس کے مطابق ایک خاص جغرافیائی حدود میں رہنے والے لوگ جو ایک ہی زبان اور نسل سے تعلق رکھتے ہیں اس وطن کو اپنا معبود اور نصب العین قرار دیتے ہیں۔ وطن ہی ان کی تمام وفاداریوں کا مرکز ہے اور وہی نیکی اور بدی۔ خیر و شر کا آخری معیار۔ اس لئے اقبال نے مختلف جگہ ''وطن،، کو دیوتا اور خدا کے نام سے پکارا ہے ع — ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ وطنیت کا یہ سیاسی نظریہ انسانیت کے لئے سم قاتل ہے کیونکہ اس کے باعث انسان آدمیت سے محروم ہو کر اسفل السافلین تک جا پہنچتا ہے۔

آں چناں قطع اخوت کردہ اند ۔۔۔ بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
تا وطن را شمع محفل ساختند ۔۔۔ نوع انسان و اقبائل ساختند
ایں شجر جنت ز عالم بردہ است ۔۔۔ تلخئی پیکار بار آوردہ است
آدمی اندر جہاں افسانہ شد ۔۔۔ آدمی از آدمی بیگانہ شد

اسلام کا مقصد محض انسانوں کی اخلاقی اصلاح نہیں بلکہ ان کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب پیدا کرنا ہے جو قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو بدل کر خالص انسانی شعور پیدا کرے۔ ''اسلام نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی اور نہ پرائیویٹ بلکہ خالصۃ انسانی ہے اور اس کا مقصد تمام فطری امتیازات کے باوجود عالم بشریت کو متحد اور منظم کرنا ہے۔ ایسا نظام صرف عقائد کی بنا پر ہی قائم ہوسکتا ہے۔ صرف یہی وہ طریقہ ہے جس سے عالم انسان کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے۔،، (حرف اقبال ۲۰۱—۲۰۲)

یہ اساسی عقیدہ اقبال کے خیال میں صرف توحید ہے جس کی بنا پر انسانی

سوسائٹی کو ایک بہتر طریقے سے منظم کیا جاسکتا ہے۔ توحید کا مفہوم یہ ہے کہ ہماری وفاداریاں ملوک و سلاطین اور دیگر ساری مفادات سے ہٹ کر صرف ذات الہی سے مخصوص ہو جائیں۔ چونکہ یہ ذات الہیہ فی الحقیقت زندگی کی روحانی اساس ہے اس لئے اللہ کی اطاعت دوسرے لفظوں میں انسان کی اپنی فطرت صحیحہ کی اطاعت ہوئی ۔ جب اس اصل توحید کو سیاسی اصول عمل کی حیثیت دی جاتی ہے تو اس سے انسان کو بہ حیثیت انسان دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت ملک قوم رنگ نسل وغیرہ کے امتیاز بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک قابل امتیاز اگر کوئی شے ہے تو وہ انسانی اعمال کا اچھا اور برا ہونا ہے نہ کہ اسکا رنگ و نسل وغیرہ۔ ''وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل و زبان و رنگ سے بالا ہو۔ جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائیگا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کرسکے گا۔'' (حرف اقبال ص ۲۳)

برتر از گردوں مقام آدم است　　اصل تہذیب احترام آدم است

اقبال نے جب بین الاقوامی سطح پر جمعیت اقوام کی مخالفت کی تو اس کا باعث بھی اس نظریہ وطنیت کی مخالفت تھی۔ اس کے خیال میں کوئی ایسا بین الاقوامی ادارہ جسکی بنیاد انسانوں کے اجتماع کی بجائے محض اقوام کا اجتماع ہو کبھی خیر و سعادت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اس کے نزدیک صحیح نصب العین جمعیت اقوام کی بجائے جمعیت آدم ہونا چاہئے۔

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود　　اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

اقبال نے اپنے کلام میں لادینی جمہوریت کی سخت مخالفت کی ہے جس کی بنا پر لوگوں نے اسپر فسطائیت کا الزام لگایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی مخالفت کا باعث جمہور دشمنی نہیں بلکہ جمہوریت دشمنی ہے۔ وہ عام لوگوں کی صلاحیت کا نہ منکر ہے اور نہ ان کو آزادی رائے اور صحیح اختیارات دینے کے خلاف ہے۔ اس کے خیال میں ہر بنی آدم تکریم و عظمت کا حامل ہے۔ نیٹشے کے خیال میں عوام صحیح معنوں میں ''انعام'' ہیں اور اس لئے اس نے تمام اختیارات و حقوق ان سے لے کر فوق البشر کے سپرد کر دئے ان کے لئے سوائے تقلید اور پیروی کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ لیکن اقبال کے ذہن میں عوام سے متعلق کوئی ایسا پست تخیل موجود نہیں۔ ''اسلامی جمہوریت ایک روحانی اصول ہے۔ جس کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ ہر انسان چند

بالقوہ صفات کا حامل ہے جو ایک خاص قسم کی سیرت کی تشکیل سے بروئے کار آسکتی ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جن لوگوں نے بہترین کارنامے پیش کئے وہ بھی عوام ہی تھے۔،، (دیباچہ اسرار خودی۔ انگریزی ترجمہ صفحہ ۱۹، لاهور ۱۹۵۰)

اقبال نے جب جمہوریت پر اعتراض کیا ہے تو اس سے اسکی مراد جمہوریت کی وہ شکل ہے جو مغرب میں موجود ہے جس کی اساس وطن و قوم کے غلط تصور پر قائم ہے اور جس نے لوگوں کو اخلاق اور انسانیت کا پیغام دینے کے بجائے فتنہ و فساد، خون ریزی اور ہلاکت، استحصال اور لوٹ مار کے بازار گرم کئے ہیں۔ یہ سرمایہ داروں کی جنگ زرگری ہے قیصریت اور استبداد کا ایک پردہ ہے۔ اس ''شراب رنگ و بو،، کو اختیار کرنے سے سوائے نامرادی کے اور کچھ حاصل نہیں۔

فرنگ آئین جمہوری نہاد است   رسن از گردن دیوے کشاد است
ز باغش کشت و پرانے نکوتر   ز شہر او بیابانے نکوتر
گروہے را گروہے در کمین است   خدایش یار اگر کارش چنین است

جمہوریت کی حقیقی غلطی اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ لادینی نقطہ نگاہ کے زیر اثر مغرب نے لوگوں کو ہر معاملے میں مطلق العنان بنا دیا ہے ان کے نزدیک اگر کوئی مقصد و مطلب ہے تو صرف مادی منفعت نہ کہ انسانی بھلائی۔ صحیح روحانی جمہوریت وہ ہے جس میں اقتدار کا ماخذ عوام کی بجائے ذات باری ہو۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے   حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

جاوید نامہ میں اس سلسلے میں کہتا ہے:

غیر حق چوں ناہی و آمر شود   زور در بر ناتولان قاسر شود
زیر گردوں آمری وزکا پری است   آمری از ما سوائر کافری است

اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسانوں کو اجتماعی طور پر کسی نظام کی ضرورت نہیں بلکہ صرف وہی نظام مملکت عدل و انصاف قائم کر سکتا ہے جسکی بنیاد اخلاق اور روحانی اصولوں پر ہو۔ الحکم اللہ اور الملک اللہ۔ جب تک انسانی تمدن کی بنیاد عالمگیر روحانی اصولوں پر نہ رکھی جائے تب تک امن و عافیت ممکن نہیں۔ مغرب کی لادینی مادیت نے مختلف شکلیں اختیار کی ہیں کبھی وہ جمہوری قبا میں ظاہر ہوتی ہے کبھی وہ اشتراکیت کی شکل میں

جلوہ فگن ہوتی ہے لیکن در حقیقت یہ سب قدیم جاہلیت ہی کی تازہ شکلیں ہیں اور ان سے عہدہ برا ہونے کیلئے اسی روحانی ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے جس نے پہلے بھی اس جاہلیت کے طلسم کو توڑا تھا۔

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم
گزر اس دور میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

علامہ اقبال اور سلطان ٹیپو شہید

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

حضرت علامہؒ مرحوم کو سلطان شہید سے جسقدر عقیدت اور ارادت تھی اسکا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے سلطان شہید کو ''جاوید نامہ،، میں جنت الفردوس میں دکھایا ہے اور اسکی زبان سے زندگی، عزت اور شہادت کی حقیقت بیان کی ہے۔ اسکے علاوہ انہوں نے ضرب کلیم میں بھی ''سلطان ٹیپو کی وصیت،، کے عنوان سے اسکی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے اور اس نظم جانفزا کے آخری شعر میں سلطان کی پوری زندگی کا نقشہ کھینچ دیا ہے

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

جن لوگوں نے سلطان کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے ان پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سلطان شہید نے ایک دن کے لئے بھی حق و باطل میں شرکت گوارا نہیں کی۔ اس نے جان دیدی مگر باطل کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ بس اسکی یہی ادا، اقبال کو بھا گئی جسکی بناء پر انہوں نے اسے جاوید نامے میں جنت الفردوس میں دکھا کر اپنی عقیدت اور ارادت کا اظہار کیا ہے۔

سلطان شہید رح کا نام تو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا لیکن جاوید نامے میں اقبال نے سلطان کا تذکرہ جس انداز سے کیا ہے، اسکی بدولت، سلطان کی حقیقی حیثیت دنیا پر واضح ہوگئی اور چونکہ اس زندۂ جاوید کتاب کا ترجمہ رفتہ رفتہ یورپ کی تمام زبانوں میں ہو جائیگا اسلئے اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ہو جائیگا جو انگریزوں نے اپنے مقاصد مشئومہ کی تکمیل کے لئے اس مرد مومن کے متعلق اپنی تصانیف کے ذریعہ سے علمی طبقوں میں پھیلادی تھی۔

انگریزوں کو سلطان شہید سے جسقدر عداوت اور نفرت تھی (جسکے اسباب آئیندہ اوراق میں بیان کئے جائینگے) اس کا کچھ اندازہ اس بات سے بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے کتوں کا نام ٹیپو رکھا اور سلطان کے

لباس کو اپنے چپراسیوں اور اردلیوں کا ''یونیفارم،، قرار دیا - اور دنیا کا کوئی عیب ایسا نہیں ھے جو انگریز مورخوں نے اس بطل جلیل کی ذات والا صفات سے منسوب نہ کیا ھو - علامہ' اقبال رح نے جاوید نامے میں، ان دشمنان ملت کے ھر طلسم کو پاش پاش کردیا اور صرف اس ایک شعر کے ذریعہ سے، ان کی تمام غلط بیانیوں کی تردید کردی -

آنکہ گفتارش ھمہ کردار بود
مشرق اندر خواب و او بیدار بود

چونکہ راقم الحروف کو بھی سلطان شہید رح سے غیر معمولی محبت اور عقیدت اور ارادت ھے اسلئے تسکین خاطر اور اظہار عقیدت کے لئے پہلے ان اشعار کی تشریح ھدیہ ناظرین کرونگا جو علامہ اقبال مرحوم نے سلطان شہید رح کی شان میں کہے ھیں، اسکے بعد کرنل بیٹ سن (Beatson) کی تصنیف سے سلطان کی آخری جنگ اور شہادت کے حالات اختصار کے ساتھ پیش کرونگا۔ اس شخص کی کتاب کو اسلئے منتخب کیا ھے کہ یہ شخص بذات خود ۴ مئی ۱۷۹۹ء کے معرکے میں شریک تھا - اسنے یہ کتاب ۱۸۰۰ء میں لکھی تھی اور اسوقت سے لیکر آج تک تمام مورخوں نے آخری جنگ میسور کے حالات اسی کتاب سے اخذ کئے ھیں - جو نسخہ میرے پیش نظر ھے وہ ۱۸۰۰ء میں لندن میں طبع ھوا تھا -

سیرت سلطان شہید بزبان اقبال مرحوم

جب مرشد رومی رح کی معیت میں اقبال نے جنت الفردوس میں سلطان شہید سے ملاقات کی عزت حاصل کی تو سلطان نے اقبال سے پوچھا : —

باز گو از ھند و از ھندوستان — آنکہ با کاھش نیرزد بوستان
آنکہ اندر مسجدش ھنگامہ مرد — آنکہ اندر دیر او آتش فسرد
آنکہ دل از بہر او خوں کردہ ایم — آنکہ یادش را بدل پروردہ ایم
از غم ما کن غم او را قیاس — آہ ازاں معشوق عاشق ناشناس

(معنی خیز ترجمہ) اے زندہ رود ! مجھے ھندوستان کا حال سنا - وہ ھندوستان جسکی گھاس بھی دوسرے ملکوں کے باغوں سے زیادہ قیمتی ھے، جسکی مسجدیں آج ویران پڑی ھوئی ھیں یعنی ان کے نمازیوں میں کوئی مجاھد نظر نہیں آتا - سب انگریزوں (اقوام مغرب) کی غلامی میں مست مطمئن ھیں

اور مادی فوائد کے لئے اپنا دین و ایمان نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کر رہے ہیں ۔ بقول اکبر الہ آبادی

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

سی ہندوستان کا حال سنا جسکے آتشکدہ کی آگ بالکل ٹھنڈی ہوچکی ہے اور جسکی عزت برقرار رکھنے کے لئے ہم نے اپنی جان بھی قربان کردی، جسکی یاد اب بھی ہمارے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے ۔ افسوس ! ہندوستان کے باشندوں اور حکمرانوں (مرہٹوں، نظام حیدرآباد، نواب کرناٹک، نوابین اودھ اور شمالی ہند کے دوسرے نوابوں) نے ہمیں مطلق نہ پہچانا اسی لئے کسی نے بھی وطن عزیز کی آزادی برقرار رکھنے کے سلسلے میں ہمارا ساتھ نہ دیا بلکہ مرہٹوں اور نظام حیدرآباد نے تو مادر وطن کے دشمنوں کی مدد کی ۔ [1]

زندہ رود (اقبال) جواب دیتا ہے :—

ہندیاں منکر ز قانون فرنگ — در نگیرد سحر و افسون فرنگ
روح را بار گراں آئین غیر — گرچہ آید ز آسمان آئین غیر

اسوقت (۱۹۳۱ء میں) حالت یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے فرنگی قانون کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے ہیں ۔ اور سچی بات بھی یہی ہے کہ آئین غیر اگر آسمان سے نازل ہو تو بھی بنی آدم کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا ۔

سلطان شہید رح :—

چوں بروید آدم از مشت گلے — با دلے، با آرزوئے در دلے
لذت عصیاں چشیدن کار اوست — غیر خود چیزے ندیدن کار اوست
زانکہ بے عصیاں خودی ناید بدست — تا خودی ناید بدست، آید شکست
زائر شہر و دیارم بودۂ — چشم خود را بر مزارم سودۂ
اے شناسائے حدود کائنات — در دکن دیدی ز آثار حیات ؟

جب کسی قوم میں زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور اسکے دلمیں

---

[1] آج ہندوستان میں نہ مرہٹوں کا نام باقی ہے نہ ریاست حیدرآباد یا نظام کا ،مگر سلطان ٹیپو شہید رح کا نام آج بھی زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا — (یوسف)

زرو (انقلاب کی آرزو) پیدا ہوتی ہے تو وہ قوم غلطیاں بھی کرتی ہے کیونکہ غلطیوں کے بغیر خودی کی تربیت نہیں ہوسکتی۔ خدا نے خودی کی تخلیق اس نہج پر کی ہے کہ وہ آگے بڑھنے کے لئے اپنے ماحول سے برسر پیکار ہو اور چونکہ انسان عالم الغیب نہیں ہے اسلئے اس سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں یعنی انسان ٹھوکر کھا کر ہی کچھ سیکھ سکتا ہے

اے زندہ رود! تونے (۱۹۲۹ء میں) میری مملکت کی سیاحت کی تھی اور تونے سرینگاپٹم میں میرے مزار کو بھی اپنی آنکھوں سے لگایا تھا۔ اے آشنائے راز کائنات! کیا تونے دکن میں زندگی کے کچھ آثار دیکھے ؟

زندہ رود : —

تخم اشکے ریختم اندر دکن لالہ ها روید ز خاک آں چمن
رود کاویری مدام اندر سفر دیدہ ام در جان او، شورے دگر

میں نے دکن میں اپنے آنسوؤں کے بیج بودئے ہیں انشاء اللہ اس چمن کی خاک سے بہت سے گل لالہ (سرفروش) پیدا ہونگے۔ دریائے کاویری (جسکے درمیان سرینگا پٹم کا قلعہ واقع ہے) ہنوز اسی انداز سے بہہ رہا ہے اور میں نے اسکی روانی میں زندگی کے نئے آثار دیکھے ہیں -

سلطان شہید : —

اے ترا دادند حرف دل فروز از تپ اشک توی سوزم هنوز
کاو کاو ناخن مردان راز جوئے خوں بکشاد از رگہائے ساز
آں نوا کز جان تو آید بروں می دهد هر سینه را سوز دروں
بوده ام در حضرت مولائے کل آنکه بے او طے نمی گردد سبل
گرچه آنجا جرأت گفتار نیست روح را کارے بجز دیدار نیست
سوختم از گرمئی اشعار تو بر زبانم رفت از افکار تو
گفت ایں بیتے که برخواندی زکیست اندرو هنگامه هائے زندگی است
باهماں سوزے که در سازد بجاں یک دو حرف ازما به کاویری رساں

اے زندہ رود ! قدرت نے تجھے ایسا ملکہ شاعری عطا کیا ہے کہ تیرے کلام کی گرمی سے میرے اندر بھی سوز و گداز کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ تیرے پیغام میں یہ تاثیر ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے -

مجھے سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوچکا ہے حضور ص کی شان یہ ہے کہ آپ ص کی متابعت کے بغیر کوئی شخص خدا تک نہیں پہونچ سکتا اگرچہ حضور ص کے سامنے کسی کو مجال گفتگو نہیں ہے کیونکہ دیدار کی لذت سے گفتگو کا موقع نہیں ملتا مگر چونکہ میں تیرے کلام سے متاثر ہوچکا تھا اسلئے بے اختیار تیرے افکار میری زبان پر آگئے ۔ جب حضور ص نے تیرا کلام سنا تو دریافت فرمایا کہ یہ اشعار کس کے ہیں ؟ ان میں زندگی کا ہنگامہ نظر آتا ہے ۔ بس میں چاہتا ہوں کہ تو اسی سوز و گداز کے ساتھ جو تیرے کلام میں ہے، میرا پیغام دریائے کاویری تک پہونچا دے

پیغام سلطان شہید (حقیقت حیات و مرگ و شہادت)

یہ پیغام جاوید نامے کے اہم مقامات میں سے ملے ۔ اقبال نے سلطان شہید رح کی زبان سے زندگی، موت اور شہادت کی حقیقت بیان کی ہے ۔ اس پیغام میں چار بند ہیں ۔ پہلے ان کا خلاصہ درج کرتا ہوں بعد ازاں اس پیغام کی شرح کرونگا پیغام کا متن بخوف طوالت مضمون درج نہیں کیا ہے ناظرین جاوید نامے کے صفحات ۲۱۵ تا ۲۱۸ مطالعہ فرمالیں ۔

(۱) پہلے بند میں اقبال نے رود کاویری سے خطاب کے پردے میں، ناظرین کو اس پیغام کی اہمیت سے آشنا کیا ہے اور جس عظیم الشان ہستی کا یہ پیغام ہے اسکی عظمت کو بڑے بلیغ انداز میں واضح کیا ہے ۔ اس بند کا بنیادی تصور اس مصرع میں پوشیدہ ہے :—

ع — ہیچ می دانی کہ این پیغام کیست

(۲) دوسرے بند میں اقبال نے پیغام کی تمہید اٹھائی ہے، اور اس ضمن میں ناظرین کو یہ بتایا ہے کہ اس دنیا میں کسی شے کو، ذی روح ہو یا غیر ذی روح، ثبات و قرار نہیں ہے جو آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہے ۔ لہذا موت سے بچنے کی کوشش کرنا سراسر نادانی ہے ۔ اس بند کا بنیادی تصور اس مصرع میں مضمر ہے :—

ع — زندگانی انقلاب ہر دے است

(۳) تیسرے بند سے سلطان شہید رح کا پیغام شروع ہوتا ہے ۔ اس بند میں سلطان نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ دنیا میں ہر شخص کو شاہین کی

طرح زندگی بسر کرنی چاھئے اس بند کا بنیادی تصور اس مصرع میں مندرج ھے :—

ع — یک دم شیری به از صد سال میش

(۴) چوتھے بند میں اپنے پیغام کی روح واضح کی ھے یعنی موت و حیات و شہادت کا فلسفه بیان کیا ھے اور اس ضمن میں اعلی درجے کے روح پرور حقائق و معارف بیان کئے ھیں جنکی قدر و قیمت کا اندازہ اس بند کو بار بار پڑھنے اور لوح دل پر نقش کرنے کے بعد ھی ھوسکتا ھے ۔ اس بند میں حسب ذیل حقائق بیان کئے ھیں

ع زندگی محکم ز تسلیم و رضا ست
ع بندۂ حق ضیغم و آھوست مرگ
ع مرگ آزادان زآنے بیش نیست
ع جنگ مومن سنت پیغمبری است
ع جنگ مومن چیست؟ ھجرت سوئے دوست

اس مختصر تمہید کے بعد اب پیغام کی وضاحت کرتا ھوں

پہلا بند کہتے ھیں که اے دریائے کاویری! شاید مسلسل سفر سے تو تھک گئی ھے اسلئے کچھ دیر کے لئے آھسته چل اور میری بات سن! تو مجھے جیحون اور فرات سے بھی زیادہ محبوب ھے ۔ دکن کے حق میں تیرا پانی بمنزلۂ آب حیات ھے ۔ تجھے یاد ھے کبھی تیری آغوش میں ایک بڑا با رونق شہر آباد تھا (اشارہ ھے سیرنگاپٹم کی طرف جو سلطان شہید کا پایۂ تخت تھا اور یه شہر واقعی دریائے کاویری کی آغوش میں واقع تھا ۔ واضح ھو که دریا کے درمیان ایک جگه ایک چھوٹا سا جزیرہ بن گیا ھے اس میں قلعه اور شہر واقع ھے ۔ اب وھاں بہت کم آبادی ھے مگر قلعه بدستور قائم ھے اور سلطان کا مزار بھی وھیں دولت باغ میں واقع ھے) ۔

اے کاویری! تیرے ساز میں زندگی کا سوز پوشیدہ ھے ۔ تجھے کچھ خبر بھی ھے میں کس عظیم الشان انسان کا پیغام تیرے پاس لایا ھوں؟ سن! میں اس بطل حریت کا پیغام تجھے سنانے آیا ھوں جسکی سطوت اور شوکت کا تونے مدتوں طواف کیا ھے ۔ جس نے اپنے حسن انتظام اور عادلانه قوانین کی بدولت دکن کے صحراؤں کو بہشت کا نمونه بنا دیا تھا ۔ جس نے اپنے خون سے دکن کی تاریخ کے صفحات پر اپنی تصویر بنائی ۔ جسکی قبر بھی آج لاکھوں مسلمانوں کی آرزوؤں کا مرجع بنی ھوئی ھے یعنی مسلمان آج بھی

اسکی قبر سے سرفروشی اور ایثار کا درس لے رہے ہیں۔ اور اسکی شہادت سے ایک نئی زندگی حاصل کر رہے ہیں ۔ جسکے قول اور فعل میں مطابقت کلی پائی جاتی تھی یعنی اگر وہ دوسروں کو جہاد کی تلقین کرتا تھا تو اسنے خود بھی عملاً جہاد میں حصہ لیا ۔ سلطان شہید رح کی زندگی شاهد ہے کہ وہ ۱۷۷۹ء سے ۱۷۹۹ء تک مسلسل انگریزوں سے جنگ میں مشغول رہا اور اسنے میدان جنگ ھی میں حیات ابدی حاصل کی

ع — مشرق اندر خواب و او بیدار بود

یہ پورا براعظم، فرنگیوں کی عیاریوں اور ریشہ دوانیوں اور ان کے ناپاک عزائم اور خلاف اسلام سرگرمیوں سے بے خبر تھا ۔ صرف سلطان شہید ھی واحد مسلمان حکمران تھا جس کے سامنے یہ حقیقت واضح ھوچکی تھی کہ انگریز مسلمانوں کے دشمن ھیں اور رچرڈ کے زمانے سے دشمن چلے آ رہے ھیں ۔ اس بات کا ثبوت کہ دوسرے مسلمان حکمران انگریزوں کے عزائم مشئومہ سے بے خبر تھے، اس باب سے ملتا ھے کہ جب سلطان شہید رح نے ۱۷۹۷ء میں سلطان ترکی سے انگریزوں کے خلاف فوجی امداد طلب کی تو عقل و خرد سے بیگانہ ''باب عالی،، (سلطان ترکی) نے سلطان شہید کو لکھا کہ انگریز مسلمانوں کے دوست ھیں اور ھمارے بھی دوست ھیں اسلئے ان کے خلاف صف آرا ھونے کے بجائے ان سے دوستی کی بنیاد استوار کرو۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

دوسرا بند

کہتے ھیں کہ افراد کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ھے کہ وہ زندگی کے سمندر میں بمنزلۂ امواج ھیں ۔ جسطرح موجیں اٹھتی رہتی ھیں اور فنا ھوتی رھتی ھیں اسی طرح افراد پیدا ھوتے رہتے ھیں اور فنا ھوتے رہتے ھیں ۔ کسی شخص یا شے کو ثبات یا قرار یا دوام نہیں ھے ۔ زندگی دراصل ایک انقلاب مسلسل کا نام ھے اور ھر لحظہ تبدیلی سے عبارت ھے ۔ ھر موجود کی زندگی کا تانا بانا، رفت اور بود سے بنا ھوا ھے ۔ اور اسی کی بدولت ھر شے میں ذوق نمود اور جذبۂ اظہار پایا جاتا ھے ۔ کیونکہ ھر شے اس نکتے سے پیدائشی طور پر آگاہ ھے کہ دنیاوی زندگی عارضی اور چند روزہ ھے ۔ اگر ھم اپنی زندگی کا اظہار کئے بغیر وفات پا جائینگے تو گویا ھمارا پیدا ھونا اور ایک معین عرصے تک دنیا میں رھنا بالکل بے معنی اور بے سود ھے گویا اظہار ذات کے بغیر ھمارا وجود اور عدم

دونوں یکساں ھیں۔ اسلئے ھمیں اس زندگی' مستعار کو غنیمت سمجھنا چاھئے اور حتی المقدور اپنی شخصیت کے اظہار کا انتظام کرنا چاھئے۔

جب صورت حال یہ ھے تو مبارک ھیں وہ لوگ جو اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے جدوجہد کرتے ھیں [۱] اور موت سے کسی حال میں ھراساں نہیں ھوتے کیونکہ وہ جانتے ھیں کہ پیدا ھونا ھی دلیل ھے مرنے کی۔ ''کل نفس ذائقة الموت،، ھر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ھے۔

غور سے دیکھو تو رھرو ھی سفر میں نہیں ھے۔ خود راہ (جادہ) بھی سفر میں ھے۔ جسکو تم مقیم سمجھتے ھو اگر غور سے دیکھو گے، تو معلوم ھوگا کہ وہ بھی مسافر ھے کیونکہ جو شے ساکن نظر آتی ھے وہ بھی بتدریج گھس رھی ھے، مٹ رھی ھے، فنا ھو رھی ھے یعنی ھر آن متغیر ھے۔

بظاھر کھجور کا درخت ساکن نظر آتا ھے مگر در حقیقت وہ آھستہ آھستہ فنا ھو رھا ھے اور اسکا ثبوت یہ ھے کہ وہ ایک دن بلا شبہ فنا ھو جائیگا۔ ھاں یہ دوسری بات ھے کہ ایک شے ھزار دو ھزار سال میں فنا ھوتی ھے دوسری صرف ایک رات میں مثلاً شاہ بلوط اور برگد کا درخت کئی ھزار سال تک قائم رھتا ھے کھجور کا درخت سو سال تک تر و تازہ رھتا ھے اور پروانوں اور پھولوں کی عمر صرف ایک رات ھوتی ھے۔

اس بے ثباتی کو اقبال نے یوں بیان کیا ھے کہ میں نے گل لالہ سے کہا کہ چند روز اور اس باغ میں اپنی بہار دکھا۔ تو اسنے جواب دیا کہ افسوس تو ابھی تک ھماری حقیقت سے آگاہ نہ ھوسکا۔ ع — غیر حسرت چیست پاداش نمود۔ جو شے دنیا میں آتی ھے۔ انسان، حیوان، شجر، طیور اور حجر اسکے لئے یہ بات مقدر ھوچکی ھے کہ وہ بہت سی حسرتیں ساتھ لئے ھوئے اس دنیا سے رخصت ھو۔ وجود کی تعمیر محض خس و خاشاک سے ھوتی ھے۔

تیسرا بند — اس بند میں سلطان شہید، بنی آدم کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص یہ پیغام دیتے ھیں کہ اگر دنیا میں آگئے

---

[۱] حافظ شیرازی رح نے اسی نکتے کو یوں ادا کیا ھے :—

عاقبت منزل ما وادئی خاموشان است

حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

ہو تو پھر چنگاری کی طرح زندگی مت بسر کرو۔ یہ تمہاری شان کے مطابق نہیں ہے۔ بلکہ

تاب و تب داری اگر مانند مہر پا بنہ در وسعت آباد سپہر

اگر تمہارے اندر تب و تاب ہے (اور بلا شبہ ہے) تو پھر اس دنیا میں پورے عزم و استقلال کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ بلکہ کسی خرمن کو تلاش کرو تا کہ اسے پھونک کر اپنی ہستی اپنی تابش اور گرمی کا ثبوت دے سکو۔

اقبال کے فلسفے میں 'شرار' کنایہ ہے بے مقصد زندگی سے۔ اسلئے انہوں نے سلطان کی زبان سے ہمیں یہ پیغام دیا ہے کہ اپنی زندگی کسی مقصد کے تحت بسر کرو تا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر وقت جدوجہد کرسکو اور اس جدوجہد کے پردے میں اپنی خودی کو نمایاں کرسکو۔ خودی کی پوشیدہ طاقتیں صرف جدوجہد ہی سے آشکار ہوسکتی ہیں۔ اگر زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو تو انسان عمل کی طرف مائل ہی نہیں ہو سکتا عمل کا ولولہ پیدا ہی اسوقت ہوتا ہے جب انسان اپنی زندگی کا کوئی مقصد متعین کرلے۔

سلطان شہید رح پیغام دیتے ہیں کہ اگر تمہارے اندر تب و تاب ہے تو پھر جو شے تمہارے سامنے آئے اسے جلادو یعنی تصادم اور پیکار سے اپنی ہستی کا اثبات کرو۔ اور اثبات خودی ہی میں استحکام خودی کا راز مضمر ہے

اگر تب و تاب ہے تو پھر کوہ و مرغ و گلشن و صحرا کو پھونک ڈالو بلکہ پانی میں گھسکر مچھلیوں کو بھی جلا ڈالو۔ اور اگر تمہارے سینے میں تیروں کے زخم سہنے کا حوصلہ ہو تو پھ چڑیا اور بٹیر کے بجائے شاہین کی سی زندگی بسر کرو — ع — در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر

اور شاہین ہی کی سی موت اپنے لئے پسند کرو۔

چونکہ ثبات و دوام (ابدی زندگی) عرض حیات میں ہے نہ کہ طول حیات میں اسلئے میں نے خدا سے طویل زندگی کے بجائے عریض زندگی طلب کی۔ مطلب یہ ہے کہ ثبات (ہمیشگی) اسبات پر موقوف نہیں کہ ایک شخص اس دنیا میں کے ہزار سال زندہ رہا بلکہ حیات جاوید اس بات پر موقوف ہے کہ

اس شخص نے (خواہ وہ صرف پچاس سال ھی زند رھا) اپنی مدت حیات میں کسقدر کارھائے نمایاں انجام دئے، کسقدر جدوجہد کی۔

اسی لئے میں نے خدا سے طویل زندگی کی دعا نہیں کی بلکہ یہ دعا کی کہ اے مولا کریم سو سال تک غلامی کی حالت میں زندہ رہنے کے بجائے صرف پچاس سال آزادی کی حالت میں زندگی بسر کرنے کی توفیق دے۔

چنانچہ دیکھ لو! میں نے صرف ۴۸ سال کی عمر پائی لیکن ساری زندگی جدوجہد، عمل صالح، جہاد اور سعئی پیہم میں بسر کردی اور ایک مومن کی یہی شان ھے کہ وہ جب تک زندہ ھے باطل سے برسر پیکار رھے۔ اسی لئے مجھے حیات جاوید حاصل ھوگئی۔

رفت سلطان ایں سرائے پنج روز　　نوبت او در دکن باقی ھنوز

اے مخاطب! تو جانتا ھے کہ زندگی کا مذھب یا آئین کیا ھے؟ اگر نہیں جانتا تو مجھ سے سن!

ع　یک دم شیری بہ از صد سال میش

اے مخاطب! اس دنیا میں ھر شے کا ایک دین یا کیش یا مذھب ھے جسطرح پروانے کا مذھب خاک ھوجانا ھے۔ اسی طرح زندگی کا مذھب ھے کہ جب تک انسان زندہ رھے آزاد رہ کر زندگی بسر کرے۔ غلامی کی زندگی، زندگی نہیں ھے در اصل موت ھے اور بہت ذلیل قسم کی موت ھے۔ مومن کی شان یہ ھے کہ وہ جب تک زندہ رھے شیر (حاکم) ھوکر زندہ رھے۔ کیونکہ شیر کی زندگی کا ایک لمحہ، بھیڑ بکری کی سو سال کی زندگی سے بہتر اور برتر ھے۔

واضح ھو کہ جب فروری ۱۷۹۹ء میں ولزلی (ھندوستان کے فرنگی گونر جنرل) نے اپنے معتمد میجر ڈوٹن (Doveton) کی معرفت سلطان شہید کو یہ الٹی میٹم بھیجا تھا کہ یاتو نظام کی طرح غلامی قبول کرو ورنہ جنگ کے لئے تیار ھو جاؤ۔ تو سلطان شہید نے اس چیلنج کے جواب میں یہ تاریخی فقرہ لکھ کر بھیجا تھا کہ

''انگریزوں کا غلام بن کر سو سال تک دکن پر حکومت کرنے کے مقابلے میں، آزاد رہ کر صرف ایک دن حکومت کرنا ھزار درجہ بہتر ھے''

چوتھا بند　　اس بند میں اقبال نے حسب ذیل حقائق سلطان شہید رح کی زبان سے بیان کئے ہیں :—

زندگی محکم ز تسلیم و رضا ست
موت نیرنج و طلسم و سیمیاست

کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی کو محکم (خودی کو پختہ) بنانا چاہتا ہے تو اسے لازم ہے کہ شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرلے اور نہایت خلوص کے ساتھ اس روش پر قائم رہے۔ چونکہ یہ نکتہ تعلیمات اسلامیہ کا خلاصہ ہے اسلئے اقبال نے اسکو اپنی متعدد تصانیف میں مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔ مثلاً زبور عجم میں کہتے ہیں :—

بروں کشید ز پیچاک ہست و بود مرا
چہ نکتہ ھائے مقام رضا کشود مرا

مثنوی پس چہ باید کرد میں اس نکتے کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ میں اس جگہ صرف دو شعر نقل کرتا ہوں :—

مصطفےٰ ص داد از رضائے او خبر　　نیست در احکام دیں چیزے دگر
تخت جم پوشیدہ زیر بوریا ست　　فقر و شاہی از مقامات رضا ست

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس بات سے مطلع فرما دیا ہے کہ مسلمان وہ ہے جو اللہ کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ احکام دین میں اسکے علاوہ اور کسی بات کا ذکر نہیں ہے۔ بالفاظ دگر تمام احکام دین کا خلاصہ صرف اسقدر ہے کہ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ اسلئے اسکے سامنے سر تسلیم خم کردو۔

جو شخص اللہ کی مرضی کے سامنے سرتسلیم خم کر دیتا ہے اور دنیاوی حکمرانوں سے قطع نظر کرکے اپنے حجرے میں ایک بوسیدہ بورئے پر قانع ہو جاتا ہے تو شاہان عالم اسکے سامنے سر بسجود ہو جاتے ہیں (اس حقیقت کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے کہ فقیر کے بورئے کے نیچے تخت شاہی پوشیدہ ہے) بلکہ فقر اور شاہی دونوں ہی رضاء کے مقامات میں سے ہیں یعنی اسکے اثمار شیریں ہیں۔ دیکھ لو! حضرت صدیق اکبر رض اور حضرت فاروق اعظم رض

کی زندگی میں فقیری اور شاہی دونوں شانیں جلوہ گر ہیں اور انہیں یہ نعما' اسلئے حاصل ہوئیں کہ انہوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں سر تسلیم خم کردیا تھا ۔

فقر و شاہی یہ دونوں مقامات رضاء ہیں اور ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات با برکات کی تجلیاں ہیں :-

فقر و شاہی واردات مصطفےٰ ص ست
این تجلی ھائے ذات مصطفےٰ ص ست

تسلیم و رضاء سے مراد یہ ہے کہ مرد مسلمان اپنی مرضی، اللہ کی مرضی میں اسطرح فنا کردے کہ اسکی ذاتی مرضی مطلق باقی نہ رہے یعنی وہ مشئیت ایزدی سے مطابقت کلی پیدا کرلے ۔ جس وقت یہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے تو مرد مومن کے اندر جہاد فی سبیل اللہ کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ جو چیز انسان کو جہاد و قتال فی سبیل اللہ سے باز رکھتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر میں میدان جنگ میں جاؤنگا تو گمان غالب یہ ہے کہ مارا جاؤنگا لیکن اگر کسی شخص کو اسبات کا یقین ہو جائے کہ موت اللہ کے اختیار میں ہے اور اسی وقت آئیگی جب اللہ کا حکم ہوگا (اسکی مرضی ہوگی) تو پھر وہ شخص خالد جانباز رض کی طرح بلا خوف و خطر اعداء میں گھس جائیگا اور اسکے ھاتھ میں بھی صبح سے شام تک کئی تلواریں ٹوٹ جائیں گی مگر اسپر کوئی تلوار کار گر نہیں ہوگی وہ دشمن کی صفوں میں اسطرح بے باکانہ چلے پھریگا جسطرح کوئی شخص اپنے پائیں باغ میں سیر کرتا ہے ۔

اس شیوۂ تسلیم و رضاء کی بدولت مرد مومن کے دل میں یہ یقین جا گزیں ہو جاتا ہے کہ اگر خدا نہ چاہے تو ساری دنیا کے انسان مل کر بھی مجھے قتل نہیں کرسکتے اور اگر وہ مجھے فنا کرنے کا ارادہ کرے تو ساری دنیا کے انسان مل کر بھی مجھے نہیں بچاسکتے اس یقین کی بدولت، انسان کی زندگی میں بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے یعنی اکیلا آدمی سینکڑوں آدمیوں پر بھاری ہوجاتا ہے ۔ اسی کو اقبال نے استحکام خودی سے تعبیر کیا ہے ۔

دوسرے مصرع میں علامہ نے اس عالمگیر غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے کہ موت بھی زندگی کے مقابلے میں ایک حقیقت ہے یعنی موت انسانی زندگی کے

خاتمے کا نام ہے بالفاظ دگر، موت میں انسان کو فنا کرنے کی طاقت موجود ہے۔ اقبال کہتے ہیں یہ سب باتیں غلط ہیں موت کی کوئی اصلیت یا حقیقت نہیں ہے وہ ''نیرنگ و طلسم و سیمیا،، ہے یعنی محض فریب نظر ہے۔ لوگ موت کی حقیقت سے ناواقف ہیں اسی لئے اس سے ڈرتے ہیں۔ موت زندگی کے خاتمے کا نام نہیں ہے بلکہ منازل حیات میں سے ایک منزل ہے۔ یوں سمجھو کہ موت وہ دروازہ ہے جس میں سے گذر کر ہم اعلی اور افضل زندگی کے میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو شخص ساری عمر مادیات میں گرفتار رہتا ہے یعنی نفس امارہ کی اطاعت کرتا رہتا ہے یا وہ شخص جو غلامی میں زندگی بسر کرتا ہے اور آزادی کے لئے جدوجہد نہیں کرتا وہ موت سے بیشک مر جاتا ہے۔

بندۂ حق ضیغم و آہو ست مرگ
یک مقام از صد مقام اوست مرگ

کہتے ہیں بندۂ حق (جو بندۂ نفس کی ضد ہے) بمنزلۂ شیر ہے اور موت بمنزلۂ آہو ہے پس بندۂ حق موت کو اسی طرح شکار کرلیتا ہے جسطرح شیر آہو کو۔

موت، بندۂ نفس یا محکوم غیر کو بیشک فنا کر سکتی ہے مگر بندۂ حق کو فنا نہیں کر سکتی بلکہ بندۂ حق خود موت کو شکار کر سکتا ہے۔ یہ موت اسکے مقامات میں سے محض ایک مقام ہے۔ مرنے کے بعد وہ فوراً ہی زندہ ہو جاتا ہے اور اسطرح موت پر غالب آ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ شہداء فی سبیل اللہ کو مردہ مت کہو انہیں مردہ کہنا یا مردہ سمجھنا ان کی توہین ہے۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات ط بل احیاء و لکن لا تشعرون (۲—۱۵۴)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں مردہ مت کہو سچی بات یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ جو لوگ راہ خدا میں شہید ہوجائیں وہ مرتے نہیں بلکہ حیات ابدی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

موت کافر یا غلام کی زندگی کے خاتمے کا بیشک نام ہے مگر یہی موت

مرد حر (بندۂ حق) کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ مرد مومن، موت پر اسطرح جھپٹتا ہے جسطرح شاہین کبوتر پر۔

هر زمان میرد غلام از بیم مرگ
زندگی او را حرام از بیم مرگ

اسکے برعکس، غلام ہر وقت موت کے خوف سے مرتا رہتا ہے اور چونکہ اسپر ہر وقت موت وارد ہوتی رہتی ہے اسلئے وہ ساری عمر زندگی کی لذت سے آگاہ نہیں ہوسکتا موت کے خوف سے زندگی ہی اسپر حرام ہو جاتی ہے اسے ساری زندگی جینے کا لطف حاصل نہیں ہوتا۔

بندۂ آزاد را شانے دگر
مرگ او را می دهد جانے دگر

لیکن بندۂ حق کی تو شان ہی کچھ اور ہے۔ جینے کا لطف صرف اسی کو حاصل ہوا ہے۔ وہ جب راہ خدا میں شہید ہوتا ہے تو فوراً اسے نئی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔

او خود اندیش است و مرگ اندیش نیست
مرگ آزادان ز آنے بیش نیست

مرد مومن تو ہر وقت اپنی خودی کی تکمیل کے لئے کوشاں رہتا ہے اور اگر وہ دیکھتا ہے کہ خودی کی تکمیل جان دینے سے ہوگی، تو وہ فوراً سر سے کفن باندھ کر میدان میں آ جاتا ہے۔ مرد مومن کو موت کا خیال بھولے سے بھی نہیں آتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت وقت مقررہ سے پہلے نہیں آسکتی اور جب وقت آ جائیگا تو ایک سیکنڈ کی تاخیر نہیں ہوسکتی[1]

منافق اور غلام ہر وقت موت سے خائف رہتا ہے وہ اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں میدان جنگ میں گیا تو یقیناً مارا جاؤنگا، اسی لئے وہ جہاد سے اسطرح ڈرتا ہے جسطرح قصائی سے گائے۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود وہ اپنے آپ کو موت سے نہیں بچا سکتا۔ اسکی

۱— کیا خوب کہا ہے سلطان ابوسعید ابوالخیر رح نے:—

از مرگ میندیش و غم رزق مخور
کیں هردو بوقت خویش ناچار رسد

دولت اسے موت کے پنجے سے رہائی نہیں دلاسکتی۔ اور جب وہ مرتا ہے تو ہمیشہ کے لئے مر جاتا ہے اور ساری دولت (جسکے لئے وہ موت سے بچتا رہا) یہیں رہ جاتی ہے ۔

اسی لئے اقبال نے قوم کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اس موت سے اجتناب کرو جو تمہیں ہمیشہ کے لئے قبر کی آغوش میں سلادے۔

بگذر از مرگے کہ سازد با لحد ز آنکہ این مرگیست مرگ دام و دد
مرد مومن خواھد از یزدان پاک آں دگر مرگے کہ بر گیرد ز خاک

یہ تو حیوانوں کی موت ہے ۔ کہ جب وہ مرتے ہیں تو ہمیشہ کے لئے مر جاتے ہیں، نہ ان کا نام باقی رہتا ہے اور نہ دوبارہ زندگی نصیب ہوتی ہے ۔ مومن اس موت کے بجائے خدا سے وہ موت طلب کرتا ہے جو اسے خاک (فناء کلی) سے بلند کردے ۔

وہ مرگ دگر کیا ہے ؟

آں دگر مرگ ؟ انتہائے راہ شوق آخریں تکبیر درجنگاہ شوق

وہ موت، راہ عشق کی انتہا ہے یعنی اللہ کے راستے میں شہادت

اقبال کی نگاہ میں وہ موت جو انسان کو حیات جاوید عطا کر دیتی ہے، وہ ہے جو میدان جہاد میں نصیب ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس موت کی تمنا کی چنانچہ آپ ص ارشاد فرماتے ہیں کہ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میں راہ خدا میں قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ ہو جاؤں اور پھر اسی طرح میدان جنگ میں جام شہادت نوش کروں ۔ نیز آپ ص نے فرمایا کہ جس مسلمان کے دل میں شہادت کی آرزو موجزن نہ ہو اسکا ایمان ناقص ہے ۔

جنگ شاھان جہاں غارتگری است جنگ مومن سنت پیغمبری است

اس شعر میں اقبال نے دنیا کے بادشاہوں اور مومن کی جنگ میں فرق بیان کیا ہے بادشاھان عالم کا مقصد غارت گری ہے یعنی اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنانا ۔ لیکن مومن کا مقصد اسکے برعکس سنت نبوی ص پر عمل کرنا یعنی اللہ کے بندوں کو انسانوں کی غلامی سے رہائی عطا کرنا ہوتا ہے ۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و سلم نے جسقدر جنگیں لڑیں ان سب کا مقصد صرف یہ تھا کہ انسان، انسانوں کی غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آجائے چنانچہ قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے ''وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ (۸-۳۹) اور کفار سے لڑتے رہو یہاں تک کہ کفر کا فتنہ مٹ جائے اور دین پورے طور پر اللہ ہی کے لئے ہو جائے یعنی انسان بادشاہوں کی غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آجائے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ کی غایت یہ ہے کہ کفر کا فتنہ مٹ جائے اور اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین پر گامزن ہونے کی آزادی حاصل ہو جائے۔ یعنی مسلمانوں کا مقصد حیات یہ ہے کہ ایسا ماحول پیدا کر دیں کہ کوئی انسان اللہ کے بندوں کو اپنی غلامی پر مجبور نہ کرسکے ۔

جب اہل ایران نے حضرت سعد ابن ابی وقاص رض کی خدمت میں قاصد بھیج کر یہ دریافت کیا کہ تم لوگ ہمارے ملک کیوں آئے ہو؟ فوج کشی سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ تو انہوں نے یہ جواب لکھ کر قاصد کے حوالے کیا تھا ۔

ان اللہ ارسلنا لنخرج الناس من جور الملوک و ظلمات الجہالۃ الی عدل الاسلام و نور الایمان — یعنی ہم خود نہیں آئے ہیں بلکہ ہمیں اللہ نے بھیجا ہے اور اسلئے بھیجا ہے کہ ہم ایران کے باشندوں کو بادشاہوں کے ظلم و ستم اور جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر اسلام کے عادلانہ نظام زندگی اور ایمان کے نور کی طرف لے آئیں ۔

اس جواب سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے کہ اسلام کیا ہے اور وہ مسلمانوں پر کیا فرض عائد کرتا ہے اور ضمناً یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ ہم مسلمان اپنے نصب العین سے کسقدر دور ہوچکے ہیں ۔

جنگ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست
ترک عالم، اختیار کوئے دوست

شاہان عالم تو حصول عالم کے لئے جنگ کرتے ہیں ۔ یعنی دنیا اور اہل دنیا پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن مومن کا مطمح نظر بالکل مختلف ہوتا ہے وہ محبوب حقیقی (اللہ) کی طرف ہجرت کرتا ہے یعنی اللہ کی خوشنودی کے لئے عالم کو ترک کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ عالم کا مالک اور اس پر

حکمران وہ ہے جس نے اس عالم کو پیدا کیا ہے ۔ الارض للہ والملک للہ والحکم للہ یہ دنیا بھی اللہ ہی کی ہے اور بادشاہت بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے اسلئے وہ دنیا کے مقابلے میں کوئۓ دوست (رضاء الہی) کو اختیار کرتا ہے وہ دنیا میں اپنی نہیں بلکہ اللہ کی حکومت قائم کرتا ہے ۔

جنگ دونوں کرتے ہیں ۔ بادشاہ بھی اور مومن بھی مگر بادشاہوں کی جنگ اپنے لئے ہوتی ہے مومن کی جنگ اللہ کے لئے ہوتی ہے ۔ بادشاہ اسلئے جنگ کرتا ہے کہ دنیا حاصل ہو جائۓ اور وہ داد عیش دے سکے ۔ مومن اسلئے جنگ کرتا ہے کہ دنیا کی لذتوں کو اللہ کے لئے ترک کرے اور اسکی رضا حاصل کرے ۔ بادشاہ کا مقصد دنیا ہے مومن کا مقصد اللہ ہے ۔ اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

الجہاد رہبانیۃ الاسلام یعنی اسلام بھی ایک خاص قسم کی رہبانیت (ترک دینا) کی تعلیم دیتا ہے اور وہ جہاد ہے یعنی اللہ کے لئے — اسکی رضاء حاصل کرنے کے لئے، دنیا اور اسکی لذات کو ترک کرنا ۔ اسی مضمون کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے : —

آنکہ حرف شوق با اقوام گفت
جنگ را رہبانیٔ اسلام گفت

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کو رہبانیت اسلام قرار دیا ہے

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کو بخون خود خرید ایں نکتہ را

لیکن اس نکتے کو (کہ جہاد در اصل رہبانیت اسلام ہے) صرف شہید ہی سمجھ سکتا ہے کیونکہ وہ اس نکتے کو سمجھنے کے لئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کردیتا ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن کی رو سے مومن کا مقصود حیات نہ دنیا ہے نہ دنیاوی جاہ و اقتدار نہ حکمرانی نہ لذت کوشی بلکہ صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ۔ اسکی پوری زندگی حصول رضاء الہی کے محور پر گردش کرتی ہے ۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اسی نکتے کو یوں واضح فرمایا ہے ۔

قل ان صلاتی ونسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین

اے رسول ص آپ کہدیجئے کہ میری نماز اور میرے مراسم دینی اور میری زندگی اور میری موت صرف اللہ ھی کے لئے ھے جو ساری کائنات کا رب ھے۔

یہ حقیقت کہ جہاد دراصل رھبانیت اسلام ھے، مومن پر صرف اسوقت منکشف ھوتی ھے جب وہ شمشیر بکف میدان جنگ میں جاتا ھے اسوقت وہ سمجھتا ھے کہ جہاد رھبانیت اسلام ھے۔

پہلے مومن اللہ کے لئے اس دنیا اور اسکی لذات سے قطع نظر کرتا ھے اسکے بعد اسکے دل میں شوق شہادت موجزن ھوتا ھے کیونکہ جب تک ایک شخص ماسوی اللہ سے بکلی قطع تعلق نہ کرے وہ سر کٹانے پر آمادہ نہیں ھوسکتا۔

دنیا سے قطع تعلق کرنا ھی رھبانیت ھے۔اسکا مفہوم یہی ھے مگر کافر، ترک دنیا اسلئے کرتا ھے کہ وہ یہ سمجھتا ھے کہ یہ دنیا ناپاک ھے اور جب تک میں اس سے قطع تعلق نہیں کروں گا۔خدا کو نہیں پاسکوں گا۔

لیکن مومن اسلئے قطع تعلق کرتا ھے کہ جب تک قطع تعلق نہیں کروں گا اللہ کی راہ میں (اسے راضی کرنے کے لئے) جان قربان نہیں کر سکوں گا۔ خلاصہ کلام اینکہ رھبانیت اسلام میں یھی ھے مگر اسکا مفہوم محض ترک دنیا نہیں ھے بلکہ ترک دنیا کرنے کے بعد جہاد کرنا اور مرتبۂ شہادت حاصل کرنا۔

یہی سلطان شہید رح کا پیغام ھے۔

(۵)

چند نوادر

اکبر علی خان

نوادرات کا جو سلسلہ ہم نے اقبال ریویو میں شروع کر رکھا ہے اس کی ایک اور قسط حاضر ہے۔ اس مضمون میں وہ چیزیں پیش کی جا رہی ہیں جو علامہ اقبال کے متعلق مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں اور آج تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۔رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی مرحوم کی یہ تحریر ان کے رسالے ''اردوئی معلی،، علیگڑھ کی اشاعت نومبر ۱۹۰۴ء سے لی گئی ہے۔ علامہ اقبال کا ترانہ' ہندی سر عبدالقادر کے رسالے 'مخزن، اکتوبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ تنقید اسی سے متعلق ہے :

''مخزن،، پر تنقید :

> اکتوبر کا پرچہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض درشت زبان اور ناواقف لوگوں نے قطع نظر کرکے جو نکتہ چینی کا جواب سب و شتم سے دینا چاہتے ہیں اہل پنجاب میں جو لوگ منصف مزاج اور صحت زبان کے خواستگار ہیں وہ اپنی غلطیوں کو چھوڑتے جاتے ہیں اور نکتہ چینوں کی نکتہ چینیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر اقبال صاحب نے ایک غزل کے مقطع میں لکھا تھا :

اقبال کوئی اپنا محرم نہیں جہاں میں   معلوم ہے ہمیں کو درد نہاں ہمارا

دلگداز نے اعتراض کیا کہ اس شعر کے آخر میں 'ہمارا، کے بجائے ''اپنا،، چاہئے۔ اور اقبال نے اب اس کو بدل کر 'مخزن، میں اسطرح چھپوادیا :

اقبال کوئی اپنا محرم نہیں جہاں میں   معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

حضرت اقبال کی نظمیں روز بروز زبان کے لحاظ سے صاف ہوتی جاتی ہیں کاش کہ جیسی توجہ اور احتیاط وہ نظم میں کرتے ہیں ویسی ہی نثر میں

بھی کرتے۔ کیونکہ ہم افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ اس پرچے میں ان کے لکچر موسوم بہ ''قومی زندگی،، میں بہت سے اغلاط موجود ہیں۔

(۱) ''ان کی زندگی کا دار و مدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے،،۔ قلم کو کاٹھ کی تلوار کہنا مناسب نہیں ہے۔ البتہ اس فقرے کے آخری حصہ میں اہل پنجاب کے قاعدے کے مطابق ''جس کو قلم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے،، نہیں لکھا۔ ایں ہم غنیمت است۔

(۲) شرائط ''تبدیل ہوتی گئیں،،۔ یہاں ''ہوتے گئے،، چاہئے۔

(۳) لیکن موجودہ انسان ابتدا سے ہی .... الخ....یہاں ''ابتدا ہی سے،، چاہئے۔

(۴) ''کو،، کی بہت سی غلطیاں ہیں۔ مثلاً ''جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا،،۔ یہاں ''جس کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے،، چاہئیے۔

(۵) پردا کو پرداہ لکھا ہے۔ وغیرہ۔

۲۔علامہ اقبال کے حالات و تذکرہ پر مشتمل یہ عبارت 'تذکرہ ہزار داستان معروف بہ خم خانہ' جاوید، جلد اول مولفہ لالہ سری رام۔ ایم۔ اے۔ مصنف دھلوی خاف الصدق رائے بہادر لالہ مدن گوپال سے منقول ہے یہ تذکرہ مخزن پریس دھلی سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا اور مندرجہ تحریر مع انتخاب اشعار اس کے صفحات ۳۶۹ تا ۳۷۴ پر محیط ہے۔

اس تحریر کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ شاید وہ سب سے پہلی تحریر ہے جو علامہ اقبال کے تذکرہ کے طور پر اب تک ہمارے سامنے آئی ہے۔

علامہ اقبال ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو اپنے سفر یورپ سے واپس آئے، صاحب تذکرہ کے بیان کے مطابق یہ تحریر علامہ کے دوران سفر لکھی گئی ہے چونکہ کاتب کتاب نے تاریخ کتابت ۲۸ مارچ ۱۹۰۸ء درج کی ہے اسلئے س کو مذکورہ تاریخ سے پہلے کا قرار دینا چاہیئے۔

انتخاب اشعار میں سے صرف دو مختلف غزلوں کے تین شعر درج کئے جاتے ہیں اس لئے کہ یہی وہ باقی ماندہ اشعار ہیں جو اب تک غیر معروف ہیں اور علامہ اقبال کے کسی مجموعہ' کلام میں (چاہے وہ معروف کلام پر مشتمل ہو یا غیر معروف پر) شامل نہیں ہوئے ہیں :

''شیخ محمد اقبال ۔ ایم ۔ اے سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور۔ آپ کی ولادت ۱۸۷۰ء میں ہوئی ۔ وطن مالوفہ سیالکوٹ ہے ۔ لاہور کالج میں تعلیم پا کر ایم ۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۔ ابتدائے سن تمیز سے آپ کی طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی ۔ فن سخن کا نہایت شستہ و صحیح مذاق سخن آفرین نے آپ کی طبیعت میں ودیعت کیا ہے ۔ یہ خداداد صفت آجکل کے شعرا میں کم پائی جاتی ہے ۔ لاہور کے ایک مشاعرے میں جو آپ نے پہلے پہل غزل پڑھی اس کا ایک شعر سن کر مرزا ارشد گورگانی کو جو اتفاق سے شریک بزم مشاعرہ تھے نہایت حیرت ہوئی اور بے اختیار ان کی زبان سے نکل گیا کہ ''ہیں اقبال ایسی عمر میں اور ایسا شعر،، ! وہ شعر یہ ہے ۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے   قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور کے بامذاق لوگوں کو اس نوجوان اور ہونہار شاعر سے شناسائی ہوئی ورنہ ایام طالب علمی میں ان کی طباعی اور ذکاوت کا شہرہ صرف ان کے ہم جماعت طلباء اور دوستوں تک محدود تھا ۔ ۱۸۹۹ء میں دوستوں کے اصرار سے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں آپ نے نالہ' یتیم کے عنوان سے ایک قابل قدر نظم نہایت میٹھے سروں میں پڑھی ۔ یہ نظم دلگداز اور مؤثر ہونے کیوجہ سے کچھ ایسی مقبول خاص و عام ہوئی کہ بار بار پڑھنے کی فرمائش ہوئی ۔ اور یتیم خانہ کیلئے چندہ کی بارش ہونے لگی ۔ اس نظم نے اس شہرت کی بنیاد رکھ دی جو اطراف ہند میں پھیلی ہوئی ہے ۔ آپ کی حالت انگریزی دانی اور علوم مغربی کی تحصیل کا شوق زبان اردو کی طرف متوجہ ہونے سد راہ نہیں ہوا ۔ اور کیوں ہوتا جس حالت میں آپ فارسی اور عربی میں بھی قابل تعریف قابلیت رکھتے ہیں ۔ اور ام الالسنہ سنسکرت سے بھی نا آشنا نہیں ۔ ابتداء میں آپ نے چند غزلیں مرزا ارشد گورگانی کو دکھائیں اور پھر بلبل ہندوستان نواب فصیح الملک مرزا داغ سے بذریعہ خط و کتاب تلمذ اختیار کیا ۔ اس دن سے آج تک آپ کا کلام روز افزوں ترقی کر رہا ہے ۔

جب سے نئے رنگ میں لکھنا شروع کیا اصلاح لینے کی پابندی جاتی رہی۔ کہتے کہتے خود اچھا کہنے لگے۔ اور اپنی طرز خاص میں قابل امتیاز قابلیت حاصل کرلی۔ چونکہ غور و فکر کرنے والی خداداد لیاقت پائی ہے وہ خود ہی مصلح ہو جاتی ہے۔ نواب فصیح الملک ان کی قدر کرتے اور مافوق العادت لیاقت ذہانت بلیغ اور ہر طبیعت کی داد دیا کرتے تھے۔ اگرچہ شیخ صاحب کا کلام ابھی خاص خاص باتوں میں کہن مشق اساتذہ کے درجہ پر نہیں پہنچا ہے مگر جو خاص بات اس میں ہے وہ شعرائے نامور استادوں کے اور لوگوں کو کم نصیب ہوتی ہے۔ آپکے کلام میں بھرتی کے شعر کم پائے جاتے ہیں۔ کوئی شعر درد، وحدت اور اخلاق کی چاشنی سے خالی نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ دور دور سے داد آتی ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہونگی تو لوگ آپ کو ڈھونڈیں گے۔ آپ کو تحقیق و تنقید میں ملکہ حاصل ہے۔ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی تعلیمی مشاغل سے روز افزوں دلبستگی ہے۔ چنانچہ فی الحال تکمیل علوم اقتصاد و قانون کیلئے ولایت میں مقیم ہیں۔ آپکو تلمذ اگرچہ حضرت داغ سے رہا ہے مگر شکل پسند طبیعت کے اقتضا سے اکثر مرزا غالب کی پیروی کرتے ہیں۔ اکثر انکے کلام کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ آپکے کلام میں ایک لحمی ضرور ہے کہ کہیں کہیں خلاف محاورہ و روز مرہ اھل زبان الفاظ نظم کر جاتے ہیں۔ امید کہ کثرت مشق سے یہ نقص بھی جاتا رہیگا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مذاق سلیم کے ساتھ ساتھ آپ کی سرشت میں انصاف پسندی بھی ایسی ہے کہ آپ اپنے دیگر ہمعصروں کے برعکس واجبی نکتہ چینی سے کبھی کبھی کبیدہ خاطر نہیں ہوتے۔ بلکہ اگر اتفاق سے کبھی کوئی صحیح اعتراض کرتا ہے تو اسے بخوشی تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور ہٹ دھرمی کو مطلق دخل نہیں دیتے۔ ناظرین کی تفریح کیلئے آپکے کلام کا تھوڑا سا انتخاب درج تذکرہ کیا جاتا ہے۔

کلام کا تھوڑا سا حصہ :—

نسیم صبح نہ چھیڑے مجھے کہ دامن سے
کسی کے ھاتھ کا جھاڑا ھوا غبار ھوں میں

*　　*　　*

''جان دیگر تمھیں جینے کی دعا دیتے ھیں
پھر بھی کہتے ھیں عاشق ھمیں کیا دیتے ھیں

ایسی ذات ہے مرے واسطے عزت سے سوا
خود وہ اٹھکر مجھے محفل سے اٹھا دیتے ہیں،،

۳—علامہ اقبال کے سفر ولایت سے واپسی پر یہ نوٹ ان کے قریبی دوست محمد دین فوق نے اپنے رسالے کشمیری میگزین لاہور بابت ماہ اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۳۲—۳۵ میں لکھا تھا۔ اور دو استقبالیہ نظمیں بھی درج کی تھیں جو یہاں بھی نقل کی جاتی ہیں۔ اس نوٹ کا عنوان تھا۔

''اقبال لاہور میں،،

''ملک کے فخر اہل خطہ قوم کے سرمایہ ناز اور نیازمند فوق کے محب قدیم شیخ محمد اقبال جو اپنے وطن میں صرف پروفیسر اقبال ایم، اے تھے انگلستان اور جرمنی میں کشمیری ذہانت و طباعی کا سکہ بٹھا کر اور اپنی تعلیم کو کامیابی اور تعریف کے ساتھ تکمیل کرکے نہ صرف ایل ایل ڈی اور پی ایچ ڈی (ڈاکٹر آف فلاسفی) کی اعلی علمی ڈگریاں لیکر مع الخیر اپنے وطن کو تشریف لائے ہیں بلکہ اعلی قانونی امتحان (بیرسٹری) بھی پاس کر آئے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال جس کی شاعرانہ اور علمی قابلیت ہندوستان اور انگلستان تک مسلمہ ہے ہندوستان کا چمکدار ہیرا اور اپنی برادری (اہل خطہ) کا ایک درخشندہ گوہر ہے۔ خوش نصیب ہے وہ ملک جہاں ایسے ہونہار اور قابل نوجوان پیدا ہوں اور قابل رشک ہے وہ قوم جسکی برادری میں علم و فضل کا یہ پتلا موجود ہو۔ شیخ صاحب ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز پیر شام کی گاڑی پر لاہور تشریف لائے۔ وقت مقررہ سے پیشتر ہی انکے احباب اور دیگر بزرگان لاہور جن میں ہندو مسلمان بلا تخصیص مذہب شامل تھے استقبال کے لئے پہنچ گئے تھے۔ اقبال کا پلیٹ فارم پر قدم رکھنا تھا کہ پھولوں کی بارش شروع ہوگئی۔ اسٹیشن کے اندر اور باہر نوجوانان لاہور کا خاصا ہجوم تھا جن میں عوام کے علاوہ اکثر بیرسٹر، وکیل، سکریٹریان، انجمن ہائے ایڈیٹران اخبارات و رؤسائے شہر بھی تھے۔ اقبال نہایت خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے سب سے ملے مزاج میں ولایت والوں کی سی کوئی بات نہ تھی۔ جو سادگی آج سے تین سال پہلے تھی اب ولایت سے ہو آنے اور اتنی ڈگریاں پاس کرنے کے بعد بھی وہی نظر آئی۔ اور ایسا شخص جو نہ صرف خود ہی صاحب دل اور فقیر دوست ہو بلکہ اسکا خاندان بھی فقر و تصوف کی چاشنی کا لذت چشیدہ ہو اپنے اصلی (صوفیانہ اور سادہ) رنگ کو کب چھوڑ سکتا ہے۔ چنانچہ جب آپ ولایت گئے تو رستے میں بمقام دہلی درگاہ حضرت سلطان الاولیاء محبوب الہی

پر حاضر ہو کر اپنی کامیابی کی دعا مانگی اور اب ولایت سے واپس ہوتے ہوئے بھی حضرت محبوب الٰہی کے آستانۂ مبارک ہو کر آئے۔ اسٹیشن سے روانہ ہو کر شیخ صاحب اور ان کے احباب بھاٹی دروازہ کے باغ میں پہنچے جہاں ان کے ہم وطن دوست شیخ گلاب دین صاحب وکیل چیف کورٹ پنجاب کی طرف سے خیمہ وغیرہ ایستادہ تھے۔ خان بہادر میاں محمد شفیع صاحب بیرسٹر ایٹ لاء خوش نویس پیسہ اخبار لاہور نے ایک نظم پڑھی۔ جس سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ دوسرے دن شیخ صاحب اپنے وطن سیالکوٹ تشریف لے گئے۔ ذیل میں ایک نظم غلامی صاحب کی اور ایک نظم خیر مقدم منشی الہ یار صاحب جوگی کی درج کی جاتی ہے۔ امید ہے کہ دونوں نظمیں ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہونگی۔

ایڈیٹر۔

نظم منشی الہ یار صاحب جوگی

کدھر ہے کیف مسرت مجھے سنبھال سنبھال
کہ ہو کے آئے ولایت سے ڈاکٹر اقبال
چڑھی ہوئی ہیں خوشی کے خمار سے آنکھیں
نشہ میں چور ہوں دل ہے میرا نہال نہال

خدا کے فضل سے وہ کی ہیں ڈگریاں حاصل
کہ اس زمین میں جن کا ہے اندراج محال
گذشتہ پیر کو لاہور کے اسٹیشن پر
رئیس سارے کھڑے تھے برائے استقبال

وہ لیٹ گاڑی کا ہونا وہ انتظار شدید
وہ ہر زباں پر تیرا ذکر سبکو تیرا خیال
ترس گئیں تھیں یہ آنکھیں کسی کے درشن کو
دوبارہ لایا یہ موقع وہ ایزد متعال

وہ کشمکش تھی احبا کو دیکھنے کی ترے
رسائی پانا بھی تجھ تک تھا ایک امر محال
گلے سے ملتے تھے تیرے اچھل اچھل کر دوست
کوئی تھا دور کے نظارہ سے ہی تیرے نہال

ترس ترس کے یہ موقع خوشی کا پایا ہے
کہ آئے خیر سے گھر پھر کے حضرت اقبال

تھی حاجت ایسے ہی لیڈر کی اہل خطہ کو
جوان خیال جوان سال اور جوان اقبال

تیری ترقی کی دنیا ہے سامنے تیرے
زمانہ اب ہے موافق سنبھل ہمیں بھی سنبھال

گئے وہ دن کہ جو کہتے تھے اب مٹی یہ قوم
اڑا وہ رنگ جو سنتے تھے اب گرے پر و بال

یہی دعا ہے یہی آرزو یہی امید
کہ دوست شاد ہوں دشمن ترے رہیں پا مال

نظم منشی غلام علی خان صاحب غلامی

آمد اقبال سے جشن طرب گھر گھر ہوا
اوج پر آج پھر لاہور کا اختر ہوا

دوست اور احباب خرم ہیں تیرے دیدار سے
جبکہ تو مثل ہلال عید جلوہ گر ہوا

ڈگریاں پا کر ولایت سے تو آیا کامیاب
فلسفہ میں خاصکر بیکن کا تو ہم سر ہوا

کیوں نہ ہو ہندوستان میں تیرا شہرہ چار سو
تیرا علم و فضل اور اخلاق جب برتر ہوا

ہوگیا پنجاب میں ممتاز شہر سیالکوٹ
فخر اسکو جب کہ تیرے نام نامی پر ہوا

فاضلان دھر میں پایا ہے تونے امتیاز
کامیابی کا قلعہ ھمت سے تیری سر ہوا

حبذا تو خیریت سے واپس آیا پھر یہاں
حق میں دن لاہور کے یہ عید سے بڑھکر ہوا

آکہ تیری جاہ وچشم و دل میں ہے مدام
تیرا استقبال بزم عیش کا منظر ہوا

ہے غلامی بھی تیرا مخلص قدیم اے نیک خو
خیر مقدم کو ترے یہ بھی بدل حاضر ہوا

۴۔خمخانہ جاوید کے بعد یہ دوسری تحریر ہے جو علامہ اقبال کی

زندگی کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے لکھی گئی ہے ۔ اور چونکہ یہ انکے قریبی دوست محمد دین فوق کے قلم سے ہے اسلئے اور بھی قابل ذکر ہے ۔ کشمیری میگزین اپریل ۱۹۰۹ء کے صفحات ۳۱ تا ۳۶ پر یہ شایع ہوئی تھی عنوان یہ تھا ۔

''حالات اقبال،،

یعنی ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لاء لاہور کی تعلیمی اور شاعرانہ زندگی کے مختصر حالات :

خاندان کا مشرف بہ اسلام ہونا :—

شیخ صاحب کا کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے جسکی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے شیخ صاحب کے جد اعلی قریباً دو سو سال ہوئے مسلمان ہوئے تھے ۔ گوت انکی ''سپرو،، ہے ان کے بزرگ کا اسلام پر ایمان لانا ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوا ۔ اور وہ حسن عقیدت اس خاندان میں موجود ہے ۔

ولادت اور تعلیمی زندگی :—

آپ ۱۸۷۵ء میں بمقام سیالکوٹ اپنے خوش نصیب والدین کے گھر پیدا ہوئے اسوقت آپکی عمر پورے ۳۴ سال کی ہے ۔ ابتداء میں اکثر مسلمان بچوں کی طرح آپ نے بھی مکتب کی ہوا کھائی ۔ پھر مدرسہ میں داخل ہوئے اور پانچویں جماعت کا امتحان وظیفہ لیکر پاس کیا ۔ مڈل کے درجوں میں بھی نہ صرف تعریف کے ساتھ کامیاب ہوئے بلکہ مڈل کے آخری درجہ میں بھی وظیفہ حاصل کیا ۔ اسکے بعد باب العلوم شروع ہوتا ہے ۔ یعنی انٹرنس کلاس جو کالج کا دروازہ ہے دروازہ کھولنا ہمت و استقلال اور فتح و شکست کے بہترین آثار کا عمدہ نمونہ ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اقبال بھی جب کالج کا دروازہ کھول کر کالج کے مدارج میں داخل ہوئے ۔ یعنی جب انہوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا تو پرائمری اور مڈل کی طرح یہاں بھی سرکاری وظیفے لیکر کامیاب ہوئے ۔

آپ کی طبیعت ابتدا ہی میں ذکاوت و ذہانت کا ایک نمونہ تھی جب

آپ ایف اے (اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ) میں داخل ہوئے تو مولانا سید میر حسن صاحب جیسے قابل سخن شناس عالم متجر اور استاد مشفق کی توجہ خاص اور فیضان صحبت و تربیت نے ان جوہروں کو جلا دینے میں جو قدرت نے شیخ صاحب کی طبیعت میں امانت رکھے تھے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ سیالکوٹ کالج سے فارغ ہوکر آپ لاہور گورنمنٹ کالج کی بی اے کلاس میں داخل ہوئے۔ طبیعت چونکہ فلسفیانہ پائی تھی اسلئے بی اے کے امتحان میں فلسفہ کا مضمون لیکر نہ صرف پاس ہی ہوئے بلکہ انگریزی اور عربی میں با تعریف کامیاب رہنے کیلئے دو طلائی تمغے اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ انہی دنوں مسٹر ڈبلو آرنلڈ صاحب علیگڈھ کالج سے گورنمنٹ کالج میں چلے آئے۔ فلسفہ دانی میں آرنلڈ صاحب کی شہرت عالمگیر ہے محتاج بیان نہیں اس شہرت نے اقبال کو بے اختیار اپنی طرف کھینچا۔ آرنلڈ صاحب بھی اس ہونہار طالب علم کی تیز فہمی اور اس کے فلسفیانہ دماغ کے معترف ہوگئے اور اقبال کو شاگردی کے مرتبت سے گزار کر رفتہ رفتہ دوستی کے اعزاز تک پہنچا دیا۔ آرنلڈ صاحب اقبال کی تحقیقات علمی اور اس کی فلسفیانہ طبیعت کے متعلق فرماتے تھے کہ :

''ایسا شاگرد استاد کو محقق بنا دیتا ہے اور محقق کو محقق تر،،
غرض یونیورسٹی کی آخری تعلیم (امتحان ایم اے) کا مرحلہ بھی طے کیا اور تمام پنجاب میں فرسٹ رہنے کی وجہ سے ایک تمغہ بھی حاصل کیا۔

سلسلہ ملازمت

ایم اے پاس ہونے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاسیات مدن کے مضامین پر لکچر دینے کیلئے مقرر کئے گئے۔ پھر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ افسران کالج اور عہدہ داران تعلیم کی رائے ان کی خدمات اور ان کی لیاقت علمی کے متعلق بہت اچھی ہے۔ علمی مسائل آپ کی زندگی کے جزو ضروری ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر طالب علموں کو آپ اپنے مکان پر بھی کالج کے بعد پڑھایا کرتے ہیں۔ جب تک آپ طالب علم رہے، نیک، سعادت مند، ذہین اور محنتی رہے اور جب استاد کی حیثیت میں آئے تو ایک شفیق اور بیتکلف اور مہربان استاد ثابت ہوئے۔ اسی زمانے میں سیاست مدن پر ایک کتاب بنام ''علم الاقتصاد،، جو اپنے فن کی ایک بیش قیمت اور جامع کتاب ہے۔

سفر ولایت

تحقیقات علمی کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا اس کا علاج یہاں بھی کثرت مطالعہ کے ذریعہ ہوتا رہا لیکن :

مریض علم پر رحمت خدا کی مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر فلسفہ، قانون اور تحقیقات علمی کے لئے ولایت کا سفر اختیار کیا اور محض علم اور صرف علم کی خاطر ہی نہ صرف وطن سے، دوست و احباب سے بلکہ والدین، بال بچوں اور دیگر اعزہ سے ہزارہا میل کے فاصلے کی مفارقت اختیار کی اور دنوں اور مہینوں کے لئے نہیں بلکہ کامل دو سال تک وہاں رہے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی (پی ایچ ڈی) کی فرسٹ کلاس ڈگری ایک کتاب بنام ''فلسفہ ایران،، لکھنے سے حاصل کی۔ یہ کتاب جو لندن میں شائع ہوچکی ہے انگریزی کا ایک اعلی نمونہ ہے۔ ولایت کے بڑے بڑے اہل الرائے نے انگلستان کے مشہور پرچوں میں نہایت عمدہ مضمون لکھے۔ فضلائے یورپ نے اس کتاب کو نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ افسوس ہے کہ ایسی لاجواب تصنیف ہنوز اردو زبان میں ترجمہ نہیں ہوئی۔ جرمنی سے واپس آنے کے بعد لندن کے اسکول آف پولیٹیکل سائینس میں داخل ہوئے اور وہاں کے پروفیسروں اور عالموں اور بڑے بڑے سائنس دانوں اور انگلستان کے دیگر فضلاء، حکما اور مدبرین سے استفادہ کیا اور بیرسٹری کا امتحان بھی کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔

انگلینڈ میں بطور لکچرر و پروفیسر :

بہت کم لوگ ایسے ہیں جو تحریر و تقریر اور نظم و نثر میں یکساں روانی اور یکساں قابلیت رکھتے ہوں۔ دوران قیام انگلینڈ میں باوجود کثرت مشاغل ''اسلام،، پر چھ پبلک لکچر دئے جو نہایت مقبول ہوئے اور جس سے آپ کی مذہبی تحقیقات کی بھی دھوم مچ گئی۔ تین ماہ تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت میں آپ عربی پروفیسر بھی رہے۔

ولایت سے واپسی

صرف ۳۲-۳۳ سال کی عمر میں اتنے علمی اعزاز، اس قدر ڈگریاں اور فارسی، عربی، سنسکرت کے علاوہ یورپ کی کئی زبانوں میں ماہر ہونا اور

مقبولیت اور شہرت حاصل کرنا معمولی دماغ اور تربیت کا کام نہیں ھے۔ اقبال کی عزت جو عالم متجر ہونے کی حیثیت سے آج کل ھندوستان اور یورپ میں ھے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ھے۔ آخر آپ ولایت سے واپس وطن کو روانہ ھوئے اور بمبئی، دلی، انبالہ میں ٹھہرتے اور اپنے دوستوں سے ملتے ہوئے ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز پیر شام کی گاڑی پر لاہور تشریف لائے۔ یہاں ان کے احباب اور دیگر بزرگان لاہور بلا تخصیص مذھب ان کے خیر مقدم کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ شام کو ان کے اعزاز میں ایک پارٹی منعقد ہوئی جہاں اکثر احباب نے نظمیں بھی پڑھیں۔ ایک دن کے قیام کے بعد آپ سیالکوٹ تشریف لے گئے جہاں آپ نے ایک لکچر بھی دیا۔

اقبال کی شاعری

تعلیم کے ابتدائی مدارج میں طبع خداداد کے شاعرانہ جوہر بالکل ظاہر نہ ہوئے بلکہ جوھری خود بھی اپنے کمال سے بے خبر تھا۔ لیکن جب آپ کالج کے درجے میں پہنچے اور علم کی روشنی سے طبیعت کو جلا ہوتی گئی تو ذرہ آفتاب بن کر چمکا اور ایسا چمکا کہ عالم کو طرز جدید کی شاعری سے منور کردیا۔ فن سخن کا نہایت چستہ اور صحیح مذاق سخن آفرینی آپ کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا ھے۔ ایف اے کی طالب علمی کے دنوں ھی میں آپ نے استاذی المعظم نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ مرحوم استاد حضور نظام دکن سے اصلاح لینی شروع کی۔ چنانچہ ایک مقطع میں فرماتے ھیں :

نسیم و تشنہ ھی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ھے شاگردیٔ داغ سخندان کا

لیکن طبیعت چونکہ فلسفہ کی طرف مائل تھی اور مشکل پسند واقع ہوئی تھی اسلئے باوجود داغ کی شاگردی کے غالب کا رنگ اختیار کیا اور اس میں کامیاب ہو کر نکلے۔

شاعری کا چرچا

آپ کی شاعری کا چرچا ابتدا میں ہم جماعت طلبا تک ھی محدود تھا۔ فروری ۱۸۹۶ء میں جب کہ آپ بی اے میں پڑھا کرتے تھے آپ کی شاعری کی دھوم طلباء سے نکل کر اھل خطہ کی مجلس میں پہنچی جہاں آپ نے ایک

نظم اور چند رباعیاں پڑھیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی طبیعت شروع ہی میں کیسے ادق اور مشکل مضامین پسند کرتی تھی ۔

بزم مشاعرہ

چند سال ہوئے لاہور میں ایک بزم مشاعرہ نہایت کامیابی اور کمال رونق سے منعقد ہوا کرتی تھی ۔ اچھے اچھے سخن فہم اور شاعر جمع ہوئے تھے ۔ ایک مشاعرہ میں ہمارے نوجوان اقبال نے بھی جب کہ ۲۰-۲۲ برس کا سن تھا ۔ طرح پر ایک غزل پڑھی اور جب اس شعر پر پہنچے :

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تو مرزا ارشد گورگانی مرحوم بے اختیار واہ واہ کہہ اٹھے اور بولے :
''میاں اقبال اس عمر میں اور یہ شعر،،

یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور کے با مذاق لوگوں کو اس نوجوان اور ہونہار شاعر سے شناسائی ہوئی ۔

نالۂ یتیم

لیکن جس نظم سے آپ کی شہرت ہندوستان کے علمی طبقہ اور بالخصوص پنجاب کے ہر کس و ناکس میں پھیلی وہ ''نالہ یتیم،، کی نظم تھی جو ۱۸۹۹ء میں دوستوں کے اصرار سے آپ نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں عجب سوز و گداز اور دلنشین سروں میں پڑھی تھی ۔ نظم کا مضمون اور اس کا انداز بیان کچھ ایسا مقبول ہوا کہ لوگ بار بار سنتے تھے اور متاثر ہو ہو کر انجمن کے لئے روپے کی بارش برساتے تھے اور پھر بھی سیر نہ ہوتے تھے ۔ اس کے بعد انجمن کے ہر سالانہ جلسے میں نظم اقبال ایک ضروری جزو ہو گئی ۔

کلام کی مقبولیت

آپ کے اشعار واقعیت کا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں اور چونکہ دل میں درد اور سوز و گداز ہے اور طبیعت میں فلسفہ اور تصوف کا عشق ہے اس لئے کلام درد اور سوز کا ایک مجموعہ ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دور دور سے

داد آتی ہے ۔ چنانچہ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں :

''جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہونگی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے،،

کلام کی مقبولیت تعلیم یافتہ حضرات کے علاوہ ان پڑھ فرقہ میں بھی جا پہنچی ہے چنانچہ ایک دفعہ راقم الحروف اضلاع کانگڑہ و شملہ کے دشوار گزار پہاڑوں میں سفر کر رہا تھا وہاں جاہل و گنوار لڑکوں کو جو پہاڑوں کی چوٹیوں اور کھلے میدانوں میں مویشی چرا رہے تھے ۔ یہ شعر ایک مست اور اچھی لے میں پڑھتے ہوئے سنا ۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

آپ کی اکثر نظمیں سرکاری کورسوں میں بھی داخل ہیں اور بالعموم آپ کی غزلیں اور دیگر اشعار رسالہ مخزن کے ذریعہ جو اردو علم و ادب کا ایک بہترین رسالہ ہے، پبلک پر ظاہر ہوتے ہیں ۔ فرمائشی نظموں سے آپ بہت گھبراتے ہیں اور در حقیقت شعر طبیعت کا ایک بے اختیار جوش اور دل کا ایک ابال ہے اور پورا لطف اسی میں ہے کہ بلا تصنع اور بے ساختہ زبان پر جاری ہو ۔ آپ کی اکثر نظمیں ''ہندوستان ہمارا،، اور ''نیا شوالہ،، وغیرہ نہایت مقبول ہیں اور عام طور پر گائی جاتی ہیں ۔ ملکہ وکٹوریہ مرحومہ قیصرہ ہند کے انتقال پر ۱۹۰۱ء میں آپ نے ایک دلگداز مرثیہ لکھا تھا جس کی اکثر کاپیاں گورنمنٹ پنجاب نے بھی اپنے خرچ پر چھپوائی تھیں ۔

موجودہ حالت

انگریزی اور اسلامی فلسفہ کے علاوہ ہندو فلسفہ کا بھی آپ نے مطالعہ کیا ہے اس لئے سب مذاہب کی دل سے تعظیم کرتے ہیں ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپ کو یکساں ہر دلعزیزی حاصل ہے ۔ آپ آج کل لاہور میں قانونی پریکٹس کرتے ہیں بوجہ کثرت کار علمی مشاغل میں آج کل چنداں منہمک نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ شعر گوئی بھی تقریباً ترک ہے ۔ اکثر انجمنوں اور سوسائیٹیوں سے آپ کو تعلق ہے ۔ برادران قوم اور دوست احباب کے اصرار و التجا سے آپ نے انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کا عہدہ جنرل سیکرٹری بھی بڑی مہربانی سے قبول فرمالیا ہے اور آپ اپنا قیمتی وقت

برادری کی بہبودی و بہتری میں بھی صرف کرتے ہیں۔ اللہ تعالی قوم کے اس نوجوان کی عمر دراز کرے۔

اهل اللہ سے ارادت

انگریزی تعلیم سے نوجوانان ملک و قوم کے تمام بالخصوص مذہبی خیالات کو نقصان عظیم پہونچا ہے۔ یہ ایک حد تک درست ہے لیکن جب غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا :

مے کہ بدنام کند اهل خرد را غلط است
بلکہ مے می شود از صحبت ناداں بدنام

در حقیقت یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ ہماری تعلیم و تربیت اگر اچھے پیمانے پر ہو صحبت نیک ہو مذہبی تعلیم سے اچھی واقفیت ہو تو اسلام کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی ہم کو صراط مستقیم سے گمراہ نہیں کرسکتا۔ آج کل مشائخ اور اولیائے کرام کی طرف سے جو بدگمانی بلکہ نفرت سی تعلیم یافتہ گروہ میں پھیل رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں لیکن اقبال اور اس کا خاندان اس بات کا زندہ نمونہ ہے کہ تعلیم کیساتھ اگر تربیت اور مذہبی واقفیت بھی ہو تو مشائخ اور اولیاء کے حسن عقیدت کے اثر کو انگریزی اعلی تعلیم، سائنس اور فلسفہ اور ممالک یورپ کی سیر و سیاحت اور نئی روشنی اور تہذیب بھی زائل نہیں کرسکتی۔ چنانچہ آپ ولایت جاتے ہوئے بھی بمقام دہلی آستانہ حضرت محبوب الہیٰ پر حاضر ہوئے وہاں ایک خالص صوفیانہ نظم بھی پڑھی اور واپسی کے وقت بھی جب کہ علاوہ علمی قابلیتوں کے اضافے کے آزادی یورپ کی ہوا بھی کھا چکے تھے درگہ حضرت نظام‌الدین اولیا (محبوب الہیٰ) پر بصد عجز سر تسلیم و نیاز خم کیا۔ غرض یہ موروثی مذاق ہماری موجودہ شاعری میں بھی موجود ہے اور اس کی شاعری کا جزو ضروری بن گیا ہے۔

٥—یہ خط ''زمانہ،، کانپور۔ فروری ۱۹۱۹ء صفحہ ۱۲۴ پر ''مراسلت،، کے ذیل میں شائع ہوا تھا۔ جس قطعہ سے متعلق یہ شعر ہے وہ بھی سامنے رہے تو اچھا ہے۔ مذکورہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں جو زیر عنوان

''نصیب ماز جہان است بعد ہمت ما،،

درج تھے۔ اشعار حسب ذیل ھیں :

ھیچ می دانی که صورت بلند ھستی با فرانس
فکر رنگین و دل گرم و شراب ناب داد
روس را سرمایه جمیعت خاطر ربود
قہرا ور کوہ گراں را لرزۂ سیماب داد
ملک و تدبیر و تجارت را بانگلستان سپرد
جرمنی را چشم حیران و دل بیتاب داد
تا بر انگیزد نوائے حریت از ساز دھر
صدر جمہوریہ امریکہ را مضراب داد
ھر کسے در خورد فطرت از جناب او ببرد
بہر ما چیزے نه بود و خویش را با ما سپرد

''جناب ایڈیٹر صاحب

جنوری کے زمانہ میں کلام اقبال کے عنوان سے چند فارسی اشعار درج تھے جو میری نظر سے گزرے۔ ڈاکٹر اقبال کی اردو شاعری میں کسی کو کلام نہیں ھوسکتا بلکہ باوجود اھل زبان نہ ھونے کے آپ کی شستہ زبان اور جدت خیالات پر ھم اھل پنجاب جتنا بھی ناز کریں بجا ھے۔

بہت ھی اچھا ھوتا اگر ھمارے دوست اپنے سمند خوش خرام کا جولان اردو کے میدان ھی میں محدود رکھتے۔ فارسی کی زمین سنگلاخ پر آپ کا اسپ تازی ناخون لیتا ھوا دکھائی دیتا ھے۔

ان پانچ شعروں میں عروض اور محاورہ کئی جگہ سقیم ھے۔ مثلاً

(۱) صورت بند محاورہ نہیں۔ صورت گر یا صورت آرا کہتے ھیں۔ بند کے ساتھ نقش بند ھوا کرتا ھے۔

(۲) با فرانس سے مراد آپ کی فرانس را کی ھے۔
به فرانس کے معنی فرانس را کے ھوسکتے ھیں۔ با کے معنی ھمراہ یا بمعہ کے ھوا کرتے ھیں۔

(۳) ایرانی فرانس کو فرانسہ کہتے ھیں۔ فرانس نہیں کہتے اور تقطیع میں ف متحرک پڑتی ھے جو صحیح نہیں۔

(۴) فکر رنگین نہیں ہوتی ۔ طبع رنگین محاورہ ہے ۔

(۵) دل گرم نہیں ہوتا ۔ دل نرم، دل شاد و خورم اور سرد دل البتہ مستعمل ہے ۔

(٦) چشم حیراں کی جگہ پر سرگراں بمعنی نخوت و تکبر زیادہ موزوں ہے ۔

(۷) نوا کی بجائے صدا ہونا چاہئے ۔ ساز میں سے صدا نکلتی ہے نہ نوا ۔

(۸) امریکہ کی تقطیع میں امریک آتا ہے ۔

(۹) میں شاعر نہیں البتہ شعر پڑھنے کا شوق رکھتا ہوں اسلئے جو ذہن میں آیا بے تکلف عرض کیا ۔

بھولا ناتھ (لفٹنٹ کرنل)

۹۔یہ تحریر کرنل بھولا ناتھ کے اعتراضات کا جواب ہے جو بجائے خود علامہ اقبال کی شاعری کے بارے میں چند اشارے کرتی ہے ۔ اعتراضات کے جوابات سے قطع نظر اس کا مطالعہ اس لئے بھی دلچسپ ہے ۔

جہاں تک جوابات کا تعلق ہے وہ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں دئے گئے ہیں اور لکھنے والے (خواجہ عبدالواجد ندوی، سابق سب ایڈیٹر، 'الہلال') کے وسیع مطالعہ اور خوش ذوق کا ثبوت ہیں ۔ یہ تحریر زمانہ مارچ ۱۹ء میں صفحات ۱۷۳ تا ۱۸۰ پر شائع ہوئی تھی اور اس کا عنوان مندرجہ ذیل تھا :
''مباحثہ ڈاکٹر اقبال و کرنیل بھولا ناتھ،،

''آپ کے رسالے کے فروری نمبر میں لفٹنٹ کرنل بھولا ناتھ صاحب کی مراسلت میری نظر سے گزری ۔ غلطی ہر فرد و بشر سے ممکن ہے اس باب میں متقدمین ۔ متاخرین اہل زبان، غیر اہل زبان، فارسی گو اور ریختہ گو سب ایک سطح پر ہیں ۔ اس انسانی کمزوری کا علاج صحیح اور بیلاگ تنقید ہے ۔ صحیح تنقید ہی وہ آئینہ ہے جس میں شاھد سخن کا ایک ایک خط و خال صاف صاف نظر آتا ہے ۔ عام ناظرین پڑھتے ہیں نازک اور دلفریب اداؤں

سے واقف ہوتے ہیں اور کمال فن کی داد دیتے ہیں خود شاعر دیکھتا ہے تو اسے اپنے جوہر کمال کے پہلو بہ پہلو اپنے نقائص بھی بے نقاب نظر آتے ہیں (اگر طلب کمال کا شوق ہے تو) اپنے جوہر کو اور چمکاتا ہے اور نقائص کی اصلاح کرتا ہے۔ عہد مغلیہ میں ایران کے شعرا نے ہندوستان میں آکے جو ترقی کی وہ ان کو خود ایران میں حاصل نہیں ہوئی۔ اس کا اصل راز یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے سلاطین و امرا فیاض و فن پرور ہونے کے ساتھ خود اہل نظر اور جوہر شناس بھی ہوتے تھے۔ اپنی صحیح نکتہ چینیوں سے ذی استعداد شعرا کے جوہر چمکاتے اور ان کی خامیاں دور کرتے تھے۔ عرفی، نظیری، صائب کلیم فارسی شاعری، خصوصاً غزل گوئی کے مہر و ماہ ہیں لیکن ان کے اس کمال سخن نے مغلیہ سلاطین و امرا کے دامن تنقید میں پرورش پائی تھی۔

لیکن آج بدقسمتی سے حالت برعکس ہے۔ سلاطین امرا جمہور سب سے مذاق سلیم رخصت ہوچکا ہے اگر کوئی شاعر شہرت کے منظر عام پر آچکا ہے تو اس کا ادنی و اعلی رطب و یابس ہر قسم کا کلام یکساں ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور اگر کوئی خوشگو شاعر بدقسمتی سے گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا ہے تو اس کے عمدہ سے عمدہ اشعار کی داد دینے والا نہیں ملتا۔

ڈاکٹر اقبال شہرت کی حد سے گزر کر 'ترجمان قوم' کے درجہ تک پہنچ چکے ہیں اس لئے بہت ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ان کے کلام کی حرف گیری ناگوار معلوم ہو لیکن اگر پہلے ان کے کلام کی آزاد تنقید ضروری تھی تو اب بھی از بس ضروری ہے کیونکہ کامل سے کامل استاد بھی لغزش و خطا سے معصوم ہونے کا دعوی نہیں کر سکتا۔ درحقیقت کسی شے کا ''انسانی'' ہونا ہی اس کے ''بے عیب'' نہ ہونے کی دلیل ہے۔ کرنل بھولا ناتھ صاحب اقبال کی ایک فارسی نظم میں بعض فروگذاشتیں دکھانا چاہتے ہیں مگر مجھے ان کی اردو شاعری میں اس ہی قسم کی کمزوریاں آشکارا نظر آتی ہیں۔ ''ترانہ'' اور ''شکوہ'' ان کی شاعری کا واسطتہ العقد ہیں لیکن کیا ان کا دامن شہرت اغلاط کے دامن سے پاک ہے؟

مگر یہ لغزشیں ان کے ماہتاب کمال کے داغ ہیں۔ چاند میں بھی داغ ہیں مگر ان داغوں کی وجہ سے اسکے جمال جہاں آرا سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال کی شعر مجسم طبیعت سے غلطیاں ہوتی ہیں اور اردو اور فارسی دونوں میں ہوتی ہیں مگر ان غلطیوں کی وجہ سے میں کرنل بھولا ناتھ صاحب کا

هم آہنگ ہوکر یہ نہیں کہہ سکتا کہ ''بہت اچھا ہوتا اگر ہمارے دوست (اقبال) اپنے سمند خوش خرام کا جولان اردو ہی کے میدان میں محدود رکھتے۔ فارسی کی زمین سنگلاخ میں آپ کا اسپ تازی ناخون لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے،، واقعہ یہ ہے کہ طبع اقبال کے ''سمند خوش خرام،، نے اپنی خوش خرامی سے دونوں میدانوں کو محشرستان خیال بنادیا ہے۔ ''رموز بیخودی،، اور ''اسرار خودی،، اسکے شاہد عادل ہیں۔ غالباً اسرار خودی کے بارے میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ پروفیسر نکلسن لیکچرر کیمبرج یونیورسٹی اس کا ترجمہ انگریزی میں کر رہے ہیں اور یہ تو میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک صحبت میں اسرار خودی پڑھی جا رہی تھی۔ پروفیسر محمد کاظم شیرازی (جو خاص ایرانی ہیں اور مغربی زبانوں میں سے انگریزی اور فرانسیسی سے واقف ہیں) موجود تھے اشعار سن کر جھومتے تھے اور کہتے تھے کہ ''کاش یہ شاعر ایران میں پیدا ہوا ہوتا،،۔

ان سب باتوں سے قطع نظر مشہور مستشرق پروفیسر برون نے اپنی کتاب ''پریس اینڈ پوئیٹری آف ماڈرن پرشیا،، میں جدید شاعری کے عمدہ عمدہ نمونے درج کئے ہیں ان کا مقابلہ اقبال کی مذکورہ دونوں مثنویوں سے کیجئے اور انصاف کیجئے کہ فارسی کی زمین سنگلاخ میں ہندوستان کا یہ اسپ تازی ''ایران کے سمند خوشخرام سے پہلو مارتا ہوا جا رہا ہے یا نہیں۔

تاہم کرنل بھولا ناتھ صاحب کا یہ مراسلہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ کم از کم کرنل صاحب کی اخلاقی جرأت اور صاف گوئی کی ضرور داد دینا چاہئے۔ کرنل صاحب فرماتے ہیں کہ میں شاعر نہیں ممکن ہے یہ ایشیائی انکسار ہو لیکن اگر یہ واقعہ ہے تو آپ کے شوق سخن اور ذوق سلیم کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ آپ نے اقبال کی نظم میں اصلاح دی ہے اور از راہ عنایت وجوہ اصلاح اپنے مراسلہ میں بیان فرمائے ہیں۔ اجازت دیجئے کہ دونوں کے متعلق کچھ عرض کروں۔

۱۔۔اقبال کے پہلے شعر کے مصرعہ اول پر کرنیل بھولا ناتھ صاحب نے (آئندہ سے بغرض اختصار ہم صرف کرنل صاحب لکھیں گے) چند اعتراض فرمائے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ صورت بند محاورہ نہیں . . . . بند کے ساتھ نقش بند ہوا کرتا ہے ''مگر واقعہ یہ ہے کہ نقش بند کی طرح صورت بند بھی محاورہ ہے۔ لغت کی نداول اور مستند کتابوں کی تصریح موجود ہے امیر خسرو فرماتے ہیں :

منظرے ہو بس کشیدہ بلند
چشم بند ہزار صورت بند

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ با فرانس بمعنی فرانس را کے صحیح نہیں۔ یہ اعتراض پڑھ کے میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ ''با،، کا ''را،، کے معنی میں آنا اسقدر مشہور و معروف بات ہے کہ لغت و قواعد کی مشہور و مستند بلکہ معمولی ادنی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ یہ مصرع سنداً عرض ہے :

سنجاب دہ ز میغ با کوہ

تیسرا اعتراض لفظ فرانس پر ہے۔ اس اعتراض کے دو جزو ہیں۔ جز اول کا تعلق لفظ سے ہے اور جز دوم کا تعلق وزن سے۔ اعتراض کے جزو اول سے تفریس اسماء کی ایک اصولی بحث پیدا ہوتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ انیسویں صدی میں فارسی بولنے والے ممالک پر مغربی تہذیب کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ ہندوستان سیاسی اور علمی دونوں حیثیتوں سے انگلستان کے زیر اثر رہا۔ ایران سیاسی حیثیت سے تو انگلستان کے زیر اثر رہا مگر علمی حیثیت سے فرانس کا اثر قبول کیا۔ وسط ایشیا علمی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے اس کے زیر اثر رہا اور فرانس کا اثر اگر پڑا تو اس کی وساطت سے۔ اسلئے مغربی ناموں کا تلفظ ہر ملک نے الگ الگ کیا۔ ہندوستان میں چونکہ یہ نام انگریزوں کی وساطت سے آئے تھے اسلئے تلفظ انگریزی کے قاعدہ سے کیا گیا۔ ایران میں نام فرانسیسی زبان سے لئے گئے تھے اسلئے ان کا تلفظ فرانسیسی تلفظ کے مطابق کیا گیا۔ لہذا وسط ایشیا میں ان ناموں کا تلفظ اسی قاعدہ سے کیا گیا۔ یہ تو ایک اصولی تمہید تھی۔ اب لفظ فرانس کو لیجئے۔ انگریزی میں تو اس کا تلفظ فرانس ہے جو بعینہ اردو میں قائم ہے۔ فرانسیسی میں اس کا تلفظ فرانسے اور فراں کے بین بین ہوتا ہے جو غیر فرانسیسی کلام و زبان سے بغیر مشق کے بمشکل ادا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ایرانی فرانس کو فرانسہ کہتے ہیں تو یہ نہ تفریس ہے اور نہ کوئی مستقل نام بلکہ درحقیقت اختلاف تلفظ کا نتیجہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب مغربی نام فارسی زبان میں استعمال کئے جائیں تو ان کو مفرس بنا لینا چاہئے یا اپنی اصل حالت پر قائم رکھنا چاہئے اور اگر مفرس بنایا جائے تو کس قاعدہ سے؟ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے متعلق کوئی اصول اب تک طے نہیں ہوا ہے۔ ایرانی ارباب قلم عام قدرتی طریقہ کے پابند ہیں۔ جس نے جو لفظ جس طرح سنا ہے اسی

طرح استعمال کرتا ہے۔ بمبئی، کلکتہ، حیدرآباد سے جو فارسی اخبارات نکلتے تھے ان میں مغربی ناموں کا تلفظ اسی قاعدہ سے ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بھی اس عام قدرتی قاعدہ کے پابند ہیں۔ کرنیل صاحب اس روش کو قابل اعتراض مانتے ہیں یہ درحقیقت محاورہ اور زبان کی غلطی نہیں بلکہ اختلاف رائے ہے لیکن ایک عجیب بات ہے کہ کرنیل صاحب جس طریقہ کو پسند نہیں فرماتے خود اسی پر عمل کرتے ہیں۔ ایرانی اگر فرانس کو فرانسہ کہتے ہیں تو جرمنی کو المانیا، اٹلی کو اطالیا، جاپان کو ژاپون کہتے ہیں مگر کرنیل صاحب نے اپنی اصلاح میں ان تمام ناموں کا وہی تلفظ کیا ہے جو ہندوستان میں رائج ہے۔

پہلے شعر کے مصرعہ ثانی کے متعلق کرنیل صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ فکر رنگین اور دل گرم محاورہ نہیں۔ کیا عرض کروں اس وقت کوئی شعر یاد نہیں آتا۔ تاہم کرنیل صاحب اتنا تو ضرور تسلیم فرمائیں گے کہ خیال رنگین اور رنگین خیال و نیز گرم دل بمعنی عاشق سوختہ آتا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی فکر رنگین اور دل گرم بمعنی سوختہ عشق غلط ہوگا۔ مگر بہتر یہ ہے کہ یہ اعتراض سند کے ملنے تک ملتوی رکھا جائے اسلئے اس وقت صرف اس سرسری اشارہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

۲۔اقبال کے دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں کرنیل صاحب چشم حیران کے بدلہ سرگران زیادہ موزوں خیال فرماتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ موزونیت شاعری کے لحاظ سے ہے یا واقعہ کے خیال سے۔ شاعری کے لحاظ سے تو دل بیتاب کے لئے چشم حیران ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ رہا واقعہ تو اس کے متعلق وہ حضرات فیصلہ کر سکتے ہیں جو جرمن قوم کے اصل کیرکٹر سے واقف ہیں لیکن اگر واقعہ کے لحاظ سے سرگران موزوں ہے جب بھی سرگران چنداں مناسب نہ ہوگا کیونکہ سرگران کے معنی بقول کرنیل صاحب متکبر اور مغرور ہونگے اور آگے داد ہے اس لئے سرگرانی ہونا چاہئے۔

۳۔چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ پر یہ اعتراض ہے کہ ''ساز سے صدا نکلتی ہے نہ کہ نوا،، اسلئے نوا کے بجائے صدا ہونا چاہئے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ نوا مطلق آواز کو بھی کہتے ہیں اور نغمہ

کو بھی - موسیقی کے بارہ مقاموں میں سے ایک مقام کا نام بھی ہے امیر خسرو فرماتے ہیں :

شد زن مطرب نبوا گستری

حضرت نظامی گنجوی فرماتے ہیں :

بر زخمه چوں نے نوا سازنم

کیا اب بھی ''ساز دھر،، سے ''نوائے حریت،، کا لکھنا خلاف محاورہ ہے ؟
کرنیل صاحب کی اصلاح واقعی قابل داد ہے گو یہ اصلاح خود اصلاح طلب ہے -

(۱) پہلے شعر کا مصرعہ اول صاف بے عیب اور چست ہے البتہ ابتدا باستفہام کی وجہ سے جو بلاغت کہ مصرع میں پیدا ہوگئی تھی وہ ھاتھ سے جاتی رہی - دوسرے مصرعہ میں دل شاد نے مفہوم بدل دیا - اقبال نے فرانس کی عشق پرستی بیان کی تھی کرنیل صاحب اس کی زندہ دلی اور خوش باشی بیان فرماتے ہیں -

(۲) دوسرے شعر میں مصرعہ ثانی غور طلب ہے - سرگراں کے متعلق اعتراضات کے سلسلے میں عرض کرچکا ہوں - لفظ داد دو جگہ آیا ہے ایک بلکل فضول اور حشو ہے -

(۳) تیسرے شعر میں مصرعہ اول میں ''ش،، را دونوں میں سے ایک زائد ہے - از ھم بالکل بھرتی کے لئے لایا گیا ہے، اگر شیرازہ کا لفظ استعمال کرنا تھا تو یوں کہنا چاھئے تھا :

روس را شیرازہ جمعیت ملت گیخت

(۴) چوتھے شعر کے دونوں مصرعہ یونان اور چین کے نون کے اعلان کے بغیر موزوں نہیں ہوتے - کیا فارسی ترکیب کی حالت میں یہ جائز ہے ؟

(۵) پانچویں شعر میں دوسرے مصرعے کو موزوں کرنے کے واسطے هالند کی دال کو مشدد پڑھنا پڑتا ہے حالانکہ دال مشدد نہیں بلکہ ساکن ہے -

(۶) چھٹے شعر کے پہلے مصرعے میں در دل ماھی کے بدلہ در دل دریا ہونا چاھئے۔ ناروے کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ماھی گیری ھے اور مچھلی دریا سے نکلتی ھے۔

(۷) آٹھواں شعر نظم کے سلسلہ بیان سے الگ معلوم ھوتا ھے کیونکہ نظم میں تقسیم ازل کا ذکر ھے نہ کہ انقلاب زمانہ کا۔ اور اس شعر میں گردش روزگار کا نقشہ کھینچا گیا ھے۔

آخر میں چند لفظ ان دونوں نظموں کی عام روح (اسپرٹ) کے متعلق عرض کرنا چاھتا ھوں۔ اقبال کی نظم پڑھنے کے بعد یہ معلوم ھوتا ھے کہ شاعر نے اپنی انفرادی شخصیت، وطن کی اجتماعی شخصیت میں جذب کردی ھے۔ اقبال اس وقت اقبال نہیں بلکہ بدنصیب ھندوستان ھے۔ اس کا دل ھندوستان کا دل ھے اس کی زبان ھندوستان کی زبان ھے۔ اس کا کلام اقبال کے خیالات کی تعبیر نہیں بلکہ ھندوستان کے جذبات کی ترجمانی ھے۔ غرض وہ اس وقت ھندوستان کے دل سے محسوس کر رھا ھے اس کے دماغ سے سونچ رھا ھے اور اسی کی زبان سے بول رھا ھے اس لئے وہ جانتا ھے کہ اس موقعہ پر وہ واعظ، ناصح یا خطیب نہیں بن سکتا۔ اسے شاعر اور صرف شاعر بننا چاھئے یعنی الفاظ کے آب و رنگ سے وطن کے جذبات کی تصویر کھینچنا چاھئے۔

تھوڑی دیر کے لئے چشم ظاھر بین کو بند کر لیجئے اور ھندوستان کا دل بن کر تخیل کی نظر سے دیکھنا شروع کیجئے۔ عالم اور کاروبار عالم پیش نظر ھے فرانس عیش و طرب کی داد دے رھا ھے۔ انگلستان تجارت و حکومت کا نقارہ بجا رھا ھے۔ اس حالت کو دیکھ کر جرمنی کی نگاہ رشک حیران اور دل حوصلہ بیتاب ھے۔ اس کا کوہ استبداد زیر و زبر ھوچکا ھے امریکہ سے انسانیت پرستی اور حریت پروری کا غلغلہ بلند ھورھا ھے۔ خیال کا مسافر بحیرۂ اٹلانٹک کے دونوں جانب سیر کرکے لوٹتا ھے ھم یعنی ھندوستان۔ کون ھندوستان؟ جو کبھی روحانیت کا چشمہ' فیض تھا! جو کبھی آفتاب علم کا مطلع انوار تھا!! جو کبھی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا!!! جو کبھی عیش و عشرت کا جنت آباد تھا!!!! آج اس کی کیا حالت ھے!؟ دل پر ایک چوٹ لگتی ھے حسرت کی آنکھ سے یاس کے اشک خونین ٹپکنا چاھتے ھیں۔ ایک نہایت نازک موقع ایک علم النفسی لحظہ کمال شاعری کی امتحان گاہ، اقبال معمولی شاعر نہیں ورنہ ایک حسرت آمیز شعر کہہ کر اپنے فرض سے سبکدوش ھو جاتا۔ اس کی طبیعت نکتہ رس اور دقیقہ سنج ھے وہ جانتا

ہے کہ ایک پسماندہ قوم کے سامنے حسرت و یاس کی تصویر پیش کرنا اس کو موت کا پیغام دینا ہے اس لئے وہ ایک ایسا مضمون تلاش کرتا ہے جو عبرت انگیزی اور خود داری دونوں کی روح سے معمور ہو۔ اسے معلوم ہے کہ نا امیدی کی حالت میں نفس انسانی تسلی آمیز خیال کے لئے تشنہ لب ہوتا ہے اسے یہ بھی خبر ہے کہ یورپ و امریکہ اگرچہ مادیات میں اوج ترق پر ہیں لیکن روحانیات میں ان کے یہاں صفر ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان گو دنیاوی حیثیت سے درماندہ و بے نوا ہے لیکن روحانیت و مذہب اس کی زندگی کا عنصر غالب ہے۔ ان حالات کو پیش نظر رکھ کے وہ ایک ایسا مرقع پیش کرنا چاھتے ہیں جس میں مغرب کی مادی ترق اور روحانی تنزل اور ہندوستان کا مادی افلاس اور روحانی دولت مندی پہلو بہ پہلو نظر آئیں۔ وہ یہ خوب جانتا ہے کہ خدا کا نام اس کے ہموطنوں کے لئے کیا کشش رکھتا ہے اس لئے وہ ساز شاعری کے اسی تار کو چھیڑتا ہے اور ایک عبرت و تسلی آمیز نغمہ اس شعر کی صورت بن کے نکلتا ہے۔

ہر کسے درخورد فطرت از جناب او ببرد
بہر ما چیزے نہ بود خویش را با ما سپرد

کرنیل صاحب کی نظم پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ناظم قوم کا ایک دردمند و غمگسار ناصح ہے۔ وہ دنیا کی چہل پہل، ہل چل، جد و جہد اور رونق و گرم بازاری اور اس کے مقابلے میں اپنے عزیز وطن کی بے چینی و بے بسی کو دیکھتا ہے۔ اس کا دل خون ہوتا ہے اور یہ خون دل شعر بن کے ٹپکنے لگتا ہے وہ درد و غم سے بے چین ہے اس بے چینی کے عالم میں اقبال کی سبق آموزی اور خود داری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے وہ اپنے وطن کی پسماندگی کا ذمہ دار ''صورت آرائے ازل،، کو سمجھتا ہے اور ایک شکوہ سنج تہجہ میں چیخ اٹھتا ہے:

پیش ہر یک بہرۂ از خوان الوانش نہاد
ہند را بہر تماشا چشم دو پر آب داد

اصل یہ ہے کہ کرنیل صاحب نے اقبال کے نقطہ خیال کو نظر انداز فرمادیا چونکہ نقطۂ خیال بدل گیا اسلئے اصلاح شدہ نظم میں نہ وہ روح رہی جو اصل نظم میں تھی اور نہ وہ اثر و کیف۔

محاکمہ' اقبال و بھولا ناتھ کے متعلق یہ چند سرسری اشارات ھیں۔ اقبال کی نظم میں بلاغت کے جو لطیف و نازک نکتہ ھیں وہ تفصیل کے طالب ھیں جو اس مختصر مراسلت کے لئے موزوں نہیں اس لئے قلم انداز کرتا ھوں۔

۷۔یہ نوٹ دیا نرائن نگم کے ماھنامے ''زمانہ،، کانپور اشاعت جنوری ۱۹۲۳ء صفحہ ۶۹ سے نقل کیا جاتا ھے۔ علامہ اقبال کا کلام مختلف اوقات میں ''زمانہ،، کے صفحات کی زینت بنتا جا رھا ھے اسی تعلق کی بناء پر ایڈیٹر نے یہ نوٹ لکھا تھا اور زمانے کے مستقل عنوان ''علمی نوٹ اور خبریں،، کے تحت درج ھوا تھا :

''سر اقبال

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لاء، لاھور کو اس سال گورنمنٹ نے سر کا خطاب عطا فرمایا ھے۔ علامہ اقبال اپنی عالمگیر شہرت کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں۔ آپ کے علمی و ادبی کارنامے ھندوستان کے علاوہ یورپ و امریکہ میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ھیں۔ شکوہ، ترانہ، شمع و شاعر وغیرہ وغیرہ آپ کی بے مثل نظمیں ھیں مگر یہ قصہ ھے جب کا کہ آتش جوان تھا یعنی اس وقت آپ علامہ اقبال یا ترجمان حقیقت اقبال کے نام سے مشہور تھے۔ اب دیکھنا یہ ھے کہ سر کے خطاب کے بعد آپ کے علمی و ادبی شغف کا کیا رنگ ھوتا ھے۔ بہر حال ھم علامہ اقبال کی خدمت میں مخلصانہ مبارک باد پیش کرتے ھیں۔ ھمارے ایک دوست نے خوشی میں ایک شعر کہا ھے :

قومیت پر آگئی غالب حکومت کی ادا
پہلے تھے علامہ اقبال اب سر ھو گئے

۸۔یہ تقابلی نظمیں اور ان سے متعلقہ نوٹ شراب مثلث کے عنوان سے ''نیرنگ،، رام پور، فروری ۱۹۲۶ء میں شائع ھوئی تھیں۔ ایڈیٹر ''نیرنگ،، کا نوٹ درج ذیل ھے :

''ذیل کی تینوں نظمیں رسالہ کے مربی مولوی محمد ضیاء اللہ خان صاحب بہادر (افسر محکمہ' آڈٹ) کا عطیہ ھیں جن کو نہایت شکریۓ کے ساتھ درج کیا جاتا ھے۔ تینوں نظموں سے جو نتیجہ

اخذ ہوسکتا ہے وہ یہی موصوف نے ہر نظم کے اختتام پر تحریر فرما دیا ہے ۔ افسوس ہے کہ ''اکمال نظم اقبال،، جن کی نظم ہے وہ اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں فرماتے ۔ ایڈیٹر،،

''سعدی شیریں مقال

یک روز عقابی به پریدن بهوا خاست
اندر طلب طعمه پر و بال بیا راست
آراست پر و بال ومنی کرد و چنیں گفت:
''کامروز همه ملک جهان زیر پر ماست
ناگه ز کمین گاه یکی سخت کماندار
تیری نبره آورد و فرستاد بدو راست
بر بال عقاب آمده آں تیر جگر دوز
بر سینه چساں خورد که از پشت فروخاست
در حیرت ایں ماند که ایں آهن و آں پی
آں طاقت رفتار و پریدن ز کجا یافت
چوں خوب نگه کرد پر خویش دراں دید
گفتاز که نالیم که ''از ماست که برماست،،
سعدی تو بدا کن ز سر ایں کبرو منی را
دیدی که عقابی که منی کرد چها یافت

شیخ علیه الرحمته نے یه نتیجه نکالا که تکبر باعث زوال ہے ۔

ڈاکٹر اقبال

ماهی بچه شوخ بشاهیں بچه گفت
ایں سلسلهٔ موج که بینی همه دریاست
دارای نهنگاں خروشنده ترا زمیغ
در سینهٔ او دیده و نا دیده بلا هاست
باسیل گراں سنگ زمین گیر و سبک خیز
با گوهر تابنده و با لولوی لالاست
بیروں نتواں رفت ز سیل همه گیرش
بالائی سر ماست نه پاست همه جاست

هرلحظه جوان‌است وروان است ودوان‌است
از گردش ایام نه افزون شدونی کاست
ماهی بچه را سوز سخن چهره برافروخت
شاهین بچه خندید و ز ساحل بهوا خاست
زد بانگ که شاهینم و کارم به زمین چیست
صحراست که دریاست نه بال و پر ماست
بگزر ز سرآب و به پنهائی هوا ساز
این نکته نه بیند مگرآن دیده که بیناست

ڈاکٹر صاحب قدم اشیاء کی اور ترقی کی اور عدم تنزل اشیا کے قائل ھیں اور نفی تکبر نہیں کرتی. فقط.

اکمال نظم اقبال

صیاد اجل چون سخن ماهی و شاهین
بشنید نبرد بانگ که این لاف نزیباست
رو کرد بماهی که بسے بحر بریدم
از گردش ایام چنان خشک که صحراست
یابی نه نهنگی و نه آبی و نه موجی
نی گنج گران اوج که از گوهر رخشا است
پس گفت بشاهین که برو ملک هوا بین
آن جا که بسا اهل تبار تو هویداست
دیدیم که از پارۂ تابیده آهن
پدرود هوا کرد و نباگاه زمین راست
هر یک به ته موج و سر اوج تبازید
دانید حقیقت که بهر حال فنا هاست
چون است فنا باد بداماں چه کنی وای
اندیشں که ماں بهر ز هر گونه بلا هاست
خیزد به ترقی نگر و باز تنزل
آن دل که ودیعت بروی دیدۂ بیناست
اسباب بگیری و مسبب بشناسی
چیزے که‌درین جااست‌بدانی که‌ازان‌جااست

راقم ....

یہاں یہ نتیجہ ہے کہ اشیا فانی ہیں اور ترق و تنزل ہر چیز میں ہے سوائے ذات باری تعالیٰ کے اور اسباب ترق کا اختیار کرنا اچھا ہے مگر نتیجہ میں تنزل اور اصل سبب کو فراموش نہ کیا جائے۔

۹—یہ تحریر ایک کتابچہ ''اکبری اقبال،، کی وجہ تسمیہ بتاتی ہے۔ اکبری اقبال جیسا کہ اس تحریر سے معلوم ہوگا علامہ اقبال کے چند مزاحیہ قطعات پر مشتمل تھا جو اکبر الہ آبادی کے انداز میں کہے گئے تھے۔ یہ قطعات پہلی بار انجمن حمایت اسلام کے انتیسویں سالانہ اجلاس میں پڑھے گئے تھے جو ۱۹۱۴ء (غالباً اپریل) میں منعقد ہوا تھا۔ یہ تعارفی تحریر اس کتابچہ کے ناشر اور علامہ اقبال کے اکثر کتابچوں ''نالہ' یتیم،، ''فریاد امت،، وغیرہ کے کاتب و ناشر فضل الہی مرغوب رقم کے قلم سے ہے۔

''انجمن حمایت اسلام لاہور کے انتیسویں سالانہ جلسے میں جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا، لاہور نے لسان العصر سید اکبر حسین صاحب پنشنر جج الہ آبادی کے رنگ میں بصدارت نواب ذوالفقار علی خان صاحب ذیل کی نظم پڑھی اور اس نظم کا عنوان مذاقاً ''رگڑا،، رکھا تھا۔

پریسیڈنٹ جلسہ نواب ذوالفقار علی خان صاحب نے اپنی پر معنی ابتدائی تقریر میں ڈاکٹر صاحب موصوف کو شیکسپئیر اور سعدی سے تشبیہہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ''اگر یہی اقبال ولایت میں ہوتا تو اس کی قدر و منزلت شیکسپئیر سے بھی بڑھی ہوتی مگر افسوس کہ ہمارے اہل ملک اس کی قابلیت تامہ سے کم آشنا ہیں اس کی دنیوی زندگی کے بعد معلوم ہوگا کہ اقبال کیا چیز تھا،،۔

ڈاکٹر صاحب اس دفعہ بوجہ مصروفیت کاروبار انجمن کے لئے کوئی نظم پیشتر تیار نہ کر سکے لیکن اراکین انجمن کے بار بار اصرار سے صرف دو تین دن پہلے جلدی میں اپنے چند خیالات کو منظوم کرنا شروع کیا۔ اسلئے آپ نے جلسے میں نظم پڑھنے سے پہلے تمہیداً فرمایا کہ ''یہ چند پکوڑے ہیں جو پبلک کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرتا ہوں۔ بعض تازے اور بعض تو ان میں چوبیس گھنٹے کے تلے ہوئے ہیں مگر بعد ان پکوڑوں کے ایک تر لقمہ بھی ہوگا۔

اس اکبری رنگ کے کلام کو قوم کے اکثر افراد نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور قبولیت کے کانوں سے سنا اور تحسین کی زبان کو حرکت دی۔
اس نظم کے اشعار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اکبری رنگ کی جھلک دکھانے پر بھی کسقدر قادر ہیں۔ آپ کے اس نئے رنگ پر حضرت خواجہ حسن نظامی نے تمہید تسطیر فرمائی اور خواجہ صاحب نے ہی اس نظم کا عنوان ''اکبری اقبال،، موزوں فرمایا۔

فضل الہی مرغوب رقم،،

۹—یہ تحریر بھی ''اکبری اقبال،، سے منقول ہے۔ کتابچہ میں اس کا عنوان اسطرح درج ہے۔

تمہید

از قلم
حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی
۷۸۶ هوالکل یاسعین

اس کے بعد وہی عبارت ہے جو متن کے ذیل میں آگے آرہی ہے۔

اس کتابچہ کے اکثر ظریفانہ اشعار ''بانگ درا،، کے مزاحیہ حصہ کلام میں شامل ہیں جو شامل نہ ہوسکے تھے وہ اب علامہ اقبال کے غیر تدون کلام پر مشتمل مجموعہ ''رخت سفر،، (مرتبہ انور حارث بی اے) میں درج ہوچکے ہیں ان کی تفصیل اور مطالعے کے لئے مکمل حوالہ درج کیا جاتا ہے۔ یہاں ہر قطعہ کا مصرعہ ثانی پیش ہے تاکہ تلاش میں سہولت رہے:

جنگل میں کہہ رہی تھی ہاتھی سے کل یہ ہتھنی	رخت سفر	۱۳۰
ہوتی نہیں ہے ہم کو جنگ و جدل سے سیری	,,	۱۳۱
وہ سمجھے گا اسے جستجو کارواں ہے	,,	۱۳۱
ملا کا محتسب کا خدا کا نبی کا ڈر	,,	۱۳۹
عجیب نسخہ ہے یہ خود فراموشی کے لئے	,,	۱۳۹

اور مندرجہ ذیل قطعہ ''رخت سفر،، میں بھی شامل نہیں:

وفا داراں سہ قسم اندار بدانی زبانی اندونانی اندو جسانی
زبانی را ز منصب عزتی دہ زمینی برسر نہر نبانی

اگر باغی بخواند دیگران را بباید ز آستان او را برانی
و گر ذوق ملاقات تو دارد جوابش ده بلفظ نستزانی
وفاداران جانی را بدست آر اگر خواهی ز جانی جانستانی

''لاهور میں سیالکوٹ کے رهنے والے ایک آدمی رهتے هیں جن کا نام محمد اقبال ہے ۔ اور ڈاکٹر ہے اور بیرسٹر ہے اور پی ایچ ڈی ہے ۔ وہ شعر گاتے هیں اور شعر بجاتے هیں اور موقع پاتے هیں تو شعر پیدا بھی کر لیتے هیں ۔

میں نے ان کو آدمی اس ڈر سے کہا کہ جو لوگ آدمیت کی عینک لگائے هوئے هیں اور اقبال ان کو آدمی هی نظر آتے هیں کہیں وہ مجھ سے ثبوت نہ مانگ بیٹھیں ورنہ میں اقبال کو پیکر خاک نہیں سمجھتا اور ان کے پتلے کو آدم زاد نہیں مانتا ۔ ممکن ہے کہ وہ بشر هوں مگر ان کی بشریت فقط ان کی بیوی بچوں یا ان کے لئے مبارک هو جو ان کو گورا چٹا مونچھوں والا عقلمند پروفیسر و بیرسٹر کہتے هیں ۔

میں نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی ۔ سیالکوٹی اقبال کو بھی اور لاهوری اقبال کو بھی ، یورپین اقبال کو بھی دیکھا ہے اور لندنی اقبال کو بھی مگر کبھی آدمی نہیں پایا وہ ازل سے حیوان هیں اور حیات ابدی کے نشان هیں ۔ هندوستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو مکروہ جانتے هیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا هوں جو هند کے کسی انسان میں نہیں ۔

برسات میں مکھیاں اور پروانے دونوں پیدا هوتے هیں اور دونوں جاندار کہلاتے هیں مگر ایک آدمی کو ستاتا ہے اور مگس بے حیا کا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے رخ پر قربان هو جاتا ہے اور غیرت ڈھونڈنے والوں کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر رلاتا ہے ۔

اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو ان دیکھی شمع کا پروانہ ہے مکھیاں اس کے اشعار کو مٹھاس سمجھ کر چاٹتی هیں اور پروانے شعلہ سمجھ کر قربان هونے آتے هیں ۔

اقبال همیشہ آسمان پر اڑتے هیں زمین پر کبھی آنا هوتا ہے تو اس زمین میں جو آسمان سے زیادہ دور هوتی ہے اس لئے وہ لوگ جن کے پاس هوائی جہاز نہیں هیں یہ کہتے رہ جاتے هیں کہ اقبال کہاں هیں ؟ هم ان تک کیونکر پہنچیں ؟

ایک دن بھری سبھا کے اندر اقبال زمین پر آئے اور چند جملے ان کی زبان میں سنائے جو زمانے کی زبان کہلاتے ہیں جن کا نام اکبر ہے جو الہ آباد میں بیٹھ کر اللہ کی آبادیاں بسائے ہیں اکبر کے ہم زبان ہوکر بولنا آسان بات نہیں اکثر اشارات ربانی کے حامل ہیں اکبر کو گویا کرنے والا پہلے آنکھ سے دکھاتا ہے پھر قلم سے لکھواتا ہے اکبر کی ہر بات زمین آسمان کو ایک کردیتی ہے ہر قول وہ وجود لے کر آتا ہے جس کو انگریزی میں کریکٹر کہتے ہیں۔ اکبر نے اس دھوپ میں بال سفید کئے ہیں جس نے اسلامی سلطنت کا باغ حساب کردیا۔ اقبال نے اکبری زبان میں جو کچھ کہا وہ اکبری اقبال ہے خلقت اس کو دیکھتی ہے کہ اقبال نے کس حد تک اکبری روش کو نباہا ہے اور اکبر کیطرح کیونکر تنگ قافیوں کو کشادہ کیا ہے مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبر کی زبان میں بولتے بولتے اب اقبال کی زبان میں بھی آیا ہے خدا خیر کرے دیکھئے ان حروف کے پردہ سے کیا نکلنے والا ہے۔ ہندو استھان کی بیقراری میں کام کی باتیں درکار ہیں جن میں نتائج ہوں اور چننے کے لئے راستہ ہو۔ عبرت کے لئے دل خوش کن آگاہی و تنبیہہ ہو۔ اکبر و اقبال کا ابتدا سے یہی شیوہ رہا ہے مگر اقبال نے اور طریق سے کہا اور اکبر نے اور پیرایہ سے۔ اس نظم میں جو منشی مرغوب رقم صاحب کے ذریعہ شائع ہوئی ہے اقبال نے اکبری نقش قدم پر پاؤں اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ مضبوطی سے ہر نشان پر پاؤں جمایا ہے۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اس نظم پر وہ لکھوں جس کو لوگ ریویو کہتے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ دوسرا اس کے تیز بہاؤ کی حقیقت پر لکچر دے۔ موجیں مارنے والا سمندر جب خود نظر آتا ہے تو کسی کا یہ کہنا کہ کشتیاں چکرائیں گی سواریوں کو چکر آئیں گے بادل اٹھیں گے اور زمین پر مینھ برسائیں گے۔ فضول ہے جاننے والے خود جانتے ہیں کہ یہ طوفان کس موسم کی خبر دیا کرتا ہے اسواسطے میں اس نظم کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا اور نہ کہنا ہی اس کی اعلیٰ شان کی دلیل ہے۔

حسن نظامی

۱۔ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا یہ خط عباس علی خان لمعہ حیدرآبادی کے نام لکھا گیا تھا۔ ایک عظیم شاعر کا ایک عظیم شاعر کے بارے میں یہ

مکتوب بے انتہا اہم ہے اور چونکہ تنگ نظری سے ہٹ کر وسعت قلب کے ساتھ لکھا گیا ہے اس لئے ہر اقبال دوست کو عزیز رکھنا چاہئے۔ اصل خط انگریزی میں تھا اس کا ترجمہ پہلی بار نیرنگ خیال سالنامہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا :

''وشوا بھارتی ۔ شانتی نکیتن ۔ بنگال

۷ فروری ۱۹۳۳ء

محبی مسٹر خان

آپ کے خط اور نظم نے میرے دل پر خاص اثر کیا۔ مجھے یہ سنکر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ میری اور اپنے شاعر اعظم سر محمد اقبال کی نظموں کے درمیان ایک خاص اندرونی تعلق پاتے ہیں چونکہ میں اس زبان سے نابلد ہوں جس میں وہ اپنا کلام فرماتے ہیں اسلئے میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں ان کی اپج کی گہرائی یا ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکوں لیکن ان کی عالمگیر شہرت سے مجھے یقین ہوتا ہے کہ ان میں جاودانی علم و ادب کی عظمت ہے ۔

بارہا اس چیز نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے کہ نقادوں کی ایک جماعت میری اور سر محمد اقبال کی ادبی کوششوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کرتی ہے یہ رویہ اس ادب کے متعلق بالکل غلط ہے جو انسانی دل و دماغ کے عالمگیر پہلو سے بحث کرتا ہے اور اس طرح تمام ملکوں اور زبانوں کے شعر اور اہل فن کو ایک برادری میں منسلک کرنے کا سامان پیدا کرتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ سر محمد اقبال اور میں ادب میں صداقت اور حسن کی خاطر کام کرنے والے دو دوست ہیں اور اس جگہ یک جا ہو جاتے ہیں جہاں انسانی دماغ اپنا بہترین ہدیہ ''جاودانی انسان،، کے حضور میں پیش کرتا ہے۔

خیر اندیش

رابندر ناتھ ٹیگور

۱۱—عبدالباری آسی کی تصنیف مزاح نگار شعرا کے حالات پر مشتمل کتاب ''تذکرہ خندہ گل،، کے صفحات ۴۷—۴۸ پر یہ عبارت درج ہے جس کی اہمیت بس اتنی ہی ہے کہ یہ علامہ اقبال سے متعلق ہے :—

"اقبال — ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب پی ایچ ڈی ۔ بیرسٹر ایٹ لا ۔ لاہور کا تخلص ہے۔ آپ کے حالات غایت شہرت کی وجہ سے محتاج تعارف تعریف نہیں ۔ آپ کی شاعرانہ قوت مشق، فکر صائب تخئیل جوش وغیرہ کا ملک کا ایک ایک بچہ قائل ہے اور در اصل اردو فارسی نظموں میں آپ کو ید طولی حاصل ہے ۔ چونکہ آپ نے اکبر مرحوم کے رنگ ظرافت میں بھی کچھ فرمایا ہے اس لئے بانگ درا سے جو آپ کی نظموں غزلوں وغیرہ کا مجموعہ ہے چند اشعار کا انتخاب کرکے شامل تذکرہ کرتا ہوں ۔ اگرچہ آپ کی اصل شاعری کے مقابلے میں اس قسم کے اشعار کم سے کم درجہ بھی نہیں پاسکتے مگر صرف آپ کے نام نامی کے لحاظ سے درج کرتا ہوں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی شاعری کے لئے ہرگز آپ کا دماغ موزوں نہیں ہے ۔ کاش جو کچھ فرمایا ہے یہ نہ فرمایا ہوتا ۔ انتخاب ملاحظہ فرمائیے :

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں........الخ
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے........الخ
شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں........الخ
وعظ میں فرمادیا کل آپ نے یہ صاف صاف........الخ
بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط........الخ
تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض........الخ
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق........الخ
اتنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی........الخ
ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے........الخ
ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں........الخ
میرزا غالب خدا بخشے بجا فرما گئے........الخ
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں........الخ
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ........الخ
سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں........الخ
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا........الخ

۱۲۔—علامہ اقبال کی رحلت کے موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ بیان اخبارات کے نام جاری کیا تھا دونوں بزرگوں کی نسبت سے یہ تحریر لائق اندراج تھی :

''یہ خیال کرتے ہوئے کس قدر صدمہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اس جہاں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔ ہندوستان آپ سے بڑا اردو شاعر پیدا نہیں کرسکا۔ آپ کی وفات سے نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرق کو نقصان عظیم پہنچا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس لئے زیادہ صدمہ ہے کہ مرحوم سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔
ابوالکلام آزاد
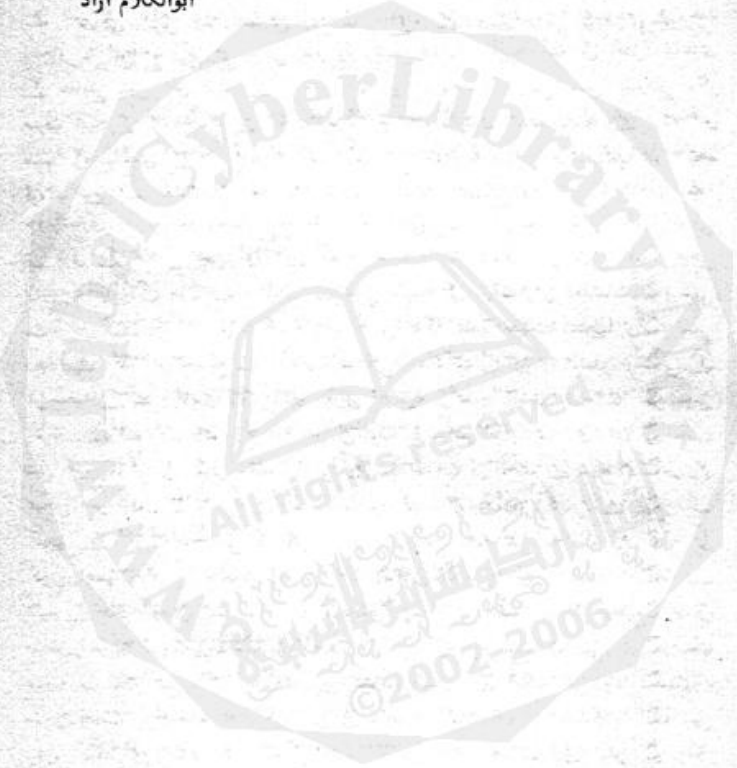
اقبال اور چند مغربی فلاسفہ

محمد امین الاسلام

شاعر مشرق علامہ اقبال دور حاضر کے ایک عظیم مفکر ہیں - اور مشرق و مغرب پر ان کے افکار کے اثرات پڑ رہے ہیں -

اس حقیقت سے تو بلا شبہ کوئی انکار نہیں کرسکتا لیکن سوال یہ کہ فلسفہ' اقبال کی اصل اہمیت کیا ہے اور اسکی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں - ہماری نگاہ میں اسکی وجہ یہ ہے کہ فلسفہ' اقبال اسی خصوصیات کا حامل ہے، جو انسانی قلوب کو بہت جلد متاثر کر دیتی ہے- جو نظریات انسانی زندگی کی ترقی کے ضامن ہیں اور اسے صراط مستقیم پہ گامزن کر دیتے ہیں، وہی فلسفہ' اقبال کی جان ہے- اقبال نے اپنے فلسفہ کی بنیاد قرآنی تعلیمات پر رکھی ہے، اس نے زندگی کو ایک خواب نہیں بلکہ زندہ حقیقت سمجھا ہے ، یہی وجہ ہے کہ اس فلسفہ نے انسان کو نئی راہ دکھائی اور وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ہادی بنا، اقبال مغربی فلاسفہ کی طرح انسانی روح کا انکار نہیں کرتا ہے، افلاطون نے روح اور اس کی قوت کا سراسر انکار کیا ہے، ان کے خیال میں اس زندگی کی کوئی حقیقت نہیں ہے ،یہ سراب کی مانند ہے - بخلاف اس کے ہیگل اس خیال کا حامی ہے کہ مادہ کی کوئی اصلیت ہی نہیں ہے روح سب کچھ ہے - کارل مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ مادہ ہی حقیقت ہے روح کی کوئی اصلیت نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مغربی مفکرین کے باہم اختلافات نے دنیا کے فکر انسانی کو پراگندہ تو کیا ہے، لیکن انسانیت کی صحیح راہ کی طرف راہبری نہیں کی- دنیا کی دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی اس پریشان خیال کا شکار تھے - ان حالات میں علامہ اقبال نے ایک نئی راہ دکھائی - مغربی فلسفہ پر سخت تنقید کی، اس کی غلطیوں کو صاف اور واشگاف الفاظ میں بیان کیا، اور کہا کہ زندگی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، اس کے انکار کرنے والے صحیح راہ سے بھٹک چکے ہیں، اس سلسلے میں اقبال نے افلاطون پر خاص طور پر تنقید کی ہے چنانچہ اس کے متعلق انہوں نے کہا --

فکر افلاطون زیان را سود گفت
حکمت او بود را نابود گفت

حقیقت یہ کہ فرد ہو کہ جماعت اگر وہ اپنی ہستی کے متعلق واقف اور حساس نہ ہو، تو اس کی تباہی و بربادی یقینی ہے، ایسا ہی تباہ کن نظریہ افلاطون نے پیش کیا، اقبال نے فکر افلاطون کے جس پہلو پر خاص طور پر تنقید کی ہے وہ اس کی ذوق عمل سے محرومی ہے، چنانچہ اقبال نے کہا —

بس کہ از ذوق عمل محروم بود
جان او وارفتہ معدوم بود
(اسرار خودی)

افلاطون اس جہان کو اور اس زندگی کی حقیقت کو تسلیم نہ کرسکا، جدوجہد سعی و عمل کا منکر رہا، اس کا دل بے بنیاد خیالات کا آماجگاہ بنا رہا، چنانچہ اقبال نے کہا —

منکر ہنگامۂ موجودہ گشت　　خالق اعیان نا مشہود گشت

علامہ اقبال نے افلاطون کی اس گمراہی پر مزید نقد و تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ افلاطون کا دل مردہ تھا، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اس دنیا کی حقیقت کا اعتراف نہ کرسکا، اور نہ ہی جدوجہد اور سعی و عمل کی ضرورت کو سمجھ سکا، کیونکہ مردہ دل کے لئے خیال محض ہی کافی ہے —

زندہ جان را عالم امکان خوش است
مردہ دل را عالم اعیان خوش است
(اسرار خودی)

عملی دنیا سے فرار کے علاوہ افلاطون کے لئے کوئی صورت ہی نہ تھی، کیونکہ اس میں جذبۂ عمل مفقود تھا۔ سعی و عمل کی حقیقت کو وہ سمجھ ہی نہ سکا، اس لئے وہ اس دنیا کی ہنگامہ پروری کو برداشت نہ کرسکا، اور یہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ چنانچہ اقبال نے کہا —

راہب ما چارۂ غیر از رم نداشت
طاقت غوغائے این عالم نداشت

حقیقت یہ کہ جو لوگ رہبانیت کے قائل ہیں وہ دنیا کے شور و غوغا کے تحمل کے لائق نہیں ہوتے، اور نہ ہی اس عملی دنیا میں ان کے لئے کوئی جگہ ہے، اس زندگی کی مسرت و فرحت کلفت و مصیبت الغرض کسی چیز کو

برداشت نہیں کر سکتے، اور نہ ہی کسی اہم کام کی ذمہ داری سنبھال سکتے ہیں، اسی لئے یہ لوگ ہمیشہ خاموش غار کی تلاش میں رہتے ہیں، لیکن اسلام میں رہبانیت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے چنانچہ حدیث میں بھی ہے لا رھبانیة فی الاسلام، کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے، چنانچہ اقبال نے بھی کہا،

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

غار و کوہ کی زندگی عیسائیت کی خصوصیت ہے ، اسلام تو تحریک اور جہاد کا قائل ہے۔ کارزار حیات میں مردانہ وار لڑنے کے بعد ہی ایک آدمی کو مومن کا خطاب دیا جا سکتا ہے ۔

اقبال کی رائے میں افلاطون جیسے ذوق عمل سے محروم فلسفی کی وجہ سے عالم انسانیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، چنانچہ اقبال نے انتہائی حسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا —

قوم ھا از سکر او مسموم گشت
خفت او از ذوق عمل محروم گشت

اہل فلسفہ میں سے بعض تو صرف روحانیت کے قائل تھے، اور بعض مادہ پرستی کے، حالانکہ دونوں گروہ انتہا پسند تھے، ان دونوں مختلف نظریات میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کرنے والی قوت صرف اسلام ہی ہے، کلام پاک میں مسلمانوں کو اس سلسلے میں ایک دعاء کی تعلیم دی گئی ہے ، چنانچہ ارشاد ہوا ربنا آتنا فی الدنیا حسنتہ وفی الآخرۃ حسنتہ وقنا عذاب النار،

اے ہمارے پروردگار ! دنیا و آخرت دونوں جہان میں بھلائی عطا فرمائیے، اور عذاب دوزخ سے نجات دیجئے۔ اسلام کے اس نظریہ کو علامہ اقبال نے کہا کہ مادہ کی اصل بھی روحانی ہے اور محض مادی دنیا کا کوئی وجود نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اقبال کی نظر میں دین اور دنیا دونوں ضروری ہیں ایک کو اختیار اور دوسرے کو ترک کرنا غیر حقیقت پسندانہ ہے ۔ اقبال نے یہ سبق سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے حاصل کیا ہے، اس لئے کہ آپ نے دنیا کا ہر کام بحسن خوبی انجام دیا حتیٰ کہ حسب ضرورت جہاد بھی کیا، اور ان تمام حالتوں میں آپ کا دل فکر آخرت سے معمور رہا :

اے کہ تیری ذات سے قائم نظام زندگی
بادشاہی میں فقیری اور شان بندگی

فلسفۂ اقبال کا مرکزی مضمون خودی ہے، اقبال کی رائے میں تخلیق کی بنیاد روح ہے، عشق الٰہی سے روح طاقتور ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس کی روح عشق الٰہی سے جتنی سرشار ہوگی اتنی ہی زیادہ وہ طاقتور بھی ہوگی، خدا کی محبت سے انسان روحانی قوت حاصل کرتا ہے اور اسی قوت کے ذریعہ رب سے قربت حاصل کرتا ہے، حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے اور انہیں یہ تقرب عشق الٰہی کے ذریعہ ہی حاصل ہوا۔ فکر اقبال کا یہ پہلو بھی بڑا نمایاں ہے کہ اسکی نگاہ میں انسان حق تعالیٰ کی غیر محدود طاقت کے اندر خود کو گم نہیں کرتا، بلکہ اتنے بلند مقام پر پہنچنے کے بعد بھی اور اتنا تقرب حاصل کرنے کے باوجود بھی اپنی خودی کو محفوظ رکھتا ہے انسان اللہ تعالیٰ سے قوت حاصل کرتا ہے، اور تقرب الٰہی کی آخری سرحد تک پہنچتا ہے، لیکن پھر انسان دنیا میں واپس آتا ہے، اور استحکام خودی کی سعی کرتا ہے ۔ خودی خدا میں گم نہیں ہوتی اس کے نور سے منور ہوتی ہے۔

انسان کی روحانی قوت کا اصل سرچشمہ عشق الٰہی ہے اور جو شخص اس میدان میں جتنا آگے بڑھیگا اتنا ہی اس کی روحانی طاقت میں اضافہ ہوگا، یہی چیز انسان کو روحانی مراتب کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچانے والی ہے اور یہی ایک انسان کو دوسروں سے امتیازی شان بھی عطا کرتی ہے، چنانچہ مرشد رومی نے کہا :

ملت عاشق ز ملت ہا جداست
عشق اصطرلاب اسرار خداست

(مثنوی)

اور یہی وجہ ہے کہ اقبال نے مسلم قوم کے احیاء کیلئے عشق الٰہی کو سب سے ضروری قرار دیا ہے ۔

عشق را آتش زن اندیشہ کن
رو بہ حق باش و شیری پیشہ کن

(رموز بے خودی)

جس طرح عشق الٰہی انسان کو غیر اللہ سے بے نیاز کردیتا ہے، بالکل اسی طرح خشیت الٰہی اس کو غیر اللہ کے خوف سے بھی نڈر اور بے پروا کر دیتا ہے، ہمیں اس کا ثبوت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے ملتا ہے، اور ناگفتہ بہ حالت میں حضرت ابوبکر رض جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

واحد رفیق سفر تھے، بہت ڈر گئے، لیکن شاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا، لاتحزن ان اللہ معنا، گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بے خوفی کی وجہ صرف اور صرف آپ کی خشیت الہیٰ اور عشق الہیٰ ہے، علامہ اقبال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اس حصہ سے بہت متاثر ہوئے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انسان کو بے خوف اور نڈر ہونے کا مشورہ دیا ہے، چنانچہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا —

این کہ در زندان غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لا تحزن بگیر

(رموز بے خودی)

یہانتک کہ اقبال نے تو اتنا بھی کہدیا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں اپنے دل سے ہر قسم کا خوف و ہراس نکالنا پڑیگا، وگرنہ تمہارا ایمان مکمل نہیں ہوگا —

گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیال بیش و کم آزاد شو

فلسفۂ اقبال کے اس نکتہ کے پس پردہ قرآن حکیم کی تعلیم کارفرما ہے۔ ارشاد ہوا، اتخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ، یعنی کیا تم انسان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے، اس لئے کہ غیر اللہ کا خوف انسان کی قوت عملی کو ختم کر دیتا ہے، اور زندگی کو تباہ کر دیتا ہے —

بیم غیراللہ عمل را دشمن است
کاروان زندگی را رہ زن است

(رموز بیخودی)

اقبال کی رائے میں غیر اللہ کا خوف ایک ایسا راہزن ہے جو انسانی قافلہ کو لوٹتا ہے، اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برباد کردیتا ہے، یہانتک کہ انہوں نے کہا کہ جو شخص سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمات سے واقف ہے وہ غیر اللہ کے خوف میں شرک کو محسوس کریگا —

ہر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

(رموز بیخودی)

چنانچه قرآن حکیم نے اس مسئله کو اس طرح بیان کیا هے ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین — اور ڈرو نهیں اور نه هی غمگین هو تم هی غالب رهوگے اگر تم مومن هو، اس آیت میں غیر الله سے بے خوف هونے کی تعلیم هے، ساتھ ساتھ ایسے لوگوں کی کامیابی کی بشارت بهی هے۔

سچ پوچھئے تو یه مسئله حد درجه مشکل بهی هے، اس لئے که ساری دنیا سے نڈر هوکر صرف خدائے واحدسے ڈرنا اور اسی کی ذات سے امید بهی رکھنا هے، اور اس کی محبت کو دل کی خاموش گهرائی میں جگه دینا هے، چنانچه سرور کائنات صلی الله علیه وسلم کی ایک حدیث میں اس مضمون کی طرف اشاره کیا گیا۔

الایمان بین الخوف والرجاء یعنی ایمان خوف اور امید کے درمیان هے، خوف خدا ایمان کی دلیل هے، اور خوف غیر الله شرک کی علامت هے — چنانچه اقبال نے کہا—

خوف حق عنوان ایمان دست و بس
خوف غیر از شرک پنهان است و بس
(رموز بیخودی)

فلسفهٔ اقبال کے مطابق انسان کے اندر ایک عظیم طاقت کا امکان هے لیکن خوف غیر الله کی وجه سے وه طاقت مخفی ره جاتی هے، اقبال انسان کی اس سوئی هوئی طاقت کو جگانا چاهتا هے۔

فارغ از اندیشهٔ اغیار شو
قوت خوابیده بیدار شو
(رموز بیخودی)

یهی وجه هے که اقبال طاقت و قوت خود اعتمادی اور بلند همتی کی تبلیغ کرتا هے۔ حقیقت یه که فرد هو که جماعت اگر کوئی همت جرأت کے ساتھ میدان عمل میں اتر جاتا هے، اور اپنی قوت عملی کا ثبوت دے سکتا هے تو اس کی کامیابی تقریباً یقینی هو جاتی هے، اقبال کی رائے میں ایک مسلمان کو یه خوبیاں توحید کی بدولت حاصل هوئی هیں، وه کهتا هے که اگر تم مسلمان هو تو اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرو، غیر الله سے بے نیاز رهو، اور سارے عالم کے لئے خیر و برکت کا پیکر بنے رهو —

مسلم استی بے نیاز از غیر شو
اهل عالم را سراپا خیر شو

ساری دنیا کے لئے خیر بننے کی تلقین قرآن کریم کی اس آیت میں بھی ہے، کنتم خیر أمته اخرجت للناس تآمرون بالمعروف و تنهون عن المنکر، یعنی تم تو بہترین امت تھے، کہ عالم انسانیت کی بھلائی کے لئے برپا کئے گئے ہو، تم اچھی باتوں کا حکم کرتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو،

فلسفہ' اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انتھک محنت اور غیر معمولی مشقت جھیلنے کی تعلیم ہے اس نے کہا کہ جس پروانہ میں جفا کشی اور عرق ریزی کی عادت ہے وهی مجھے پسند ہے -

من آن پروانہ' را پروانہ دانم
کہ جانش سخت کوش وشعلہ نوش است
(پیام مشرق)

میدان کارزار میں جانبازوں کی طرح لڑنا هی کامیابی کا باعث ہے، چنانچہ اقبال نے بڑے لطیف پیرائے میں اس چیز کو بیان کیا ہے -

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت
شریک سوز و ساز بحر و بر شو
(پیام مشرق)

اقبال کی رائے میں زندگی تحریک اور جنگ و جہاد هی کا نام ہے، ساحل پر بیٹھ کر موجوں کا تلاطم دیکھنا زندگی نہیں بلکہ ان سے ٹکر لینا زندگی ہے، بالکل اسی طرح میدان کارزار کا تماشہ دیکھنا زندگی نہیں بلکہ اس میں جان دینا هی زندگی ہے اور اسی سے حیات جاودانی حاصل هوتی ہے -

تو این جنگ از کنار عرصہ بینی
بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو
میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
(پیام مشرق)

بدریا غلط و با موجش در آویز
حیات جاودانی اندر ستیز است

یہی وجہ ہے کہ فلسفہ اقبال میں انتھک محنت اور جدوجہد کی تعلیم موجود ہے، اقبال نے اس سلسلے میں اپنی فطری کیفیت کو اس طرح بیان کیا،

چہ کنم کہ فطرت من بمقام در نسازد
دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

اقبال کی رائے میں جس شخص کو اپنی خودی کا احساس ہو، اور وہ اپنی سوئی ہوئی طاقت کو بیدار کر کے میدان عمل میں اتر جائے، تو اس وقت عمل کا ایک وسیع میدان ہاتھ آ جاتا ہے، اور صحیح معنوں میں زندگی کی تحریک شروع ہوتی ہے، اگر اس راہ میں موت بھی آتی ہے تو وہ انسان کو حیات جاودانی بخشتی ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں تصریح موجود ہے۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون — جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں تم اسے مردہ نہ کہو، بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تم سمجھ نہیں سکتے ہو، اسی لئے فلسفہ اقبال میں خطروں اور حوادث کا مقابلہ کرنے کی تعلیم موجود ہے۔ اور زندگی جفا طلبی و عرق ریزی کا نام ہے۔

سر این فرمان حق دانی کہ چیست
زیستن اندر خطر ہا زندگی است

بیکشش زندہ دلان زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نہ بردم کہ راہ بے خطر است

اقبال کا یہ نظریہ بھی قرآن کریم کی تعلیم ہی سے ماخوذ ہے، چنانچہ ارشاد ہوا والذین من جاهد او فینا لنهد ین هم سبلنا، جو لوگ میری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان ہی کو راہ دکھاتے ہیں، اللہ تعالی نے ایک دوسری جگہ اسی چیز کو اس طرح فرمایا ہے، احسبتم ان تدخلو الجنه ولما یرو العذاب کیا تم نے یہ گمان کیا کہ کسی قسم کا عذاب و تکلیف دیکھے بغیر ہی بہشت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ بغیر محنت و مشقت کے اور بلا حد درجہ سعی و عمل کے بہشت ہرگز نہیں مل سکتی ہے۔ اسلئے قرآن حکیم نے صاف اعلان کیا، ''لیس للانسان الا ما سعی''، یعنی انسان کو اس کی کوشش کے بغیر کچھ بھی نہیں ملیگا، اور خاقانی نے تو اتنا کہدیا کہ اگر کوشش کے بغیر بہشت بھی ملے، تو اس کو قبول کرنا انصاف کی بات نہیں۔

گرفتم اینکه بهشتم دهند بطاعت
قبول کردن و رفتن نه شرط انصاف است

چنانچہ اقبال نے بھی کہا کہ انسان کی عزت، عظمت اور احترام اس کی محنت و مشقت اور اس کی طاقت و قوت ھی میں ھے -

در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی ناکسی ناپختگی است
(اسرار خودی)

اور پھر اقبال نے یہ بھی کہا کہ جو آدمی اسطرح اپنی زندگی گزارتا ھے، اس سے نہ صرف اس کی اپنی زندگی کامیاب ھوتی ھے، بلکہ ساری دنیا اس سے مستفید ھوتی ھے اور دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں کامرانی اور شادمانی اس کا قدم چومتی ھے -

می شود از وے دو عالم مستنیز
ھر کہ باشد سخت کوشش وسخت گیر

خلاصہ یہ ھوا کہ فلسفہ' اقبال کے مطابق ھمت و جرأت طاقت و قوت کا حصول نیز حوادث سے ٹکرانا اور مشقتیں جھیلنا، مشکلات کا سامنا کرنا زندگی کی کامیابی کے لئے انتہائی ضروری ھے، اس کے برعکس سستی و کاھلی بے عملی اور محنت سے پہلوتی ناکامی ھی کی علامت ھے، یہی وجہ ھے کہ اقبال نے مشہور جرمن فلسفی نشٹے کی بڑی تعریف کی ھے کیونکہ دونوں فلاسفر چند مسائل میں ھم خیال ھیں، اقبال کی طرح وہ بھی مرد کامل کا قائل ھے اور اس نے بھی بے عملی و سستی کی مذمت کی ھے، اسی لئے اقبال کہتا ھے

از سستیٔ عناصر دلش تپید
فکر حکیم پیکر محکم تر آفرید
(پیام مشرق)

لیکن جس طرح ان دونوں کے درمیان چند مسائل میں اتفاق ھے اسی طرح چند اور باتوں میں اختلاف بھی ھے، مثال کے طور پر اقبال پر امید تھے، اور نشٹے یاس و قنوطیت کا شکار تھا، نشٹے خدا کا منکر تھا اور اقبال مرد مومن تھا، توحید کا قائل تھا، بلکہ اس کے سارے فکر کی بنیاد ھی اس تصور پر رکھی گئی تھی - اور پھر اقبال انسانی طاقت، اس کی ترقی، اور اس کے ماحول کے

اثرات کا قائل تھا، لیکن نٹشے ان باتوں کا قائل نہ تھا، انسان کے اندر غیر معمولی طاقت کا امکان موجود ہے، نٹشے اس بات کا منکر تھا، اس کا ''مرد کامل،، ڈرامائی انداز سے ناگہانی طور پر ظاہر ہوگا حالانکہ اس سلسلے میں اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ جس شخص کو اپنی خودی پر یقین کامل ہوگا، اور خود اعتمادی، ضبط نفس، یقین محکم، اور محنت و مشقت جھیلنے کی عادت ہوگی وہ یقیناً مرد کامل ہوگا، وہ دنیا میں خدائی طاقت قائم کرنے میں کامیاب ہوگا، اور ترقی کی آخری منزل میں پہنچیگا کہ فرشتے بھی اسے دیکھکر سہم جائیں گے، چنانچہ اس نے کہا —

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

فلسفۂ اقبال کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ امید کے قائل تھے، حالانکہ اقبال کا ماحول اس کے لئے سازگار نہ تھا، کیونکہ تقریبا دو سو سال تک ان کی قوم برطانیہ کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی، اور پھر بظاہر امید کی کوئی کرن بھی نظر نہیں آتی تھی، اس کے باوجود اقبال نے کہا کہ نومیدی اور مایوسی میں علم و عرفان کا زوال ہے، اس لئے کامیابی کی امید رکھو، —

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفان ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

یہاں تک کہ اس نے کہا زندگی کا راز امید و ارمان ہی میں مخفی ہے

اگر ز رمز حیات آگہی مجوئے دمگیر
ولے کہ از خلش خار آرزو پاک است
مشو نامید ز این مشت غبارے
پریشان جلوۂ ناپائدارے

امید کے ساتھ ساتھ طلب اور اس کی تڑپ کی بھی ضرورت ہے —

زندگانی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است
(اسرار خودی)

یاس و قنوطیت کے اندھیروں میں بھی اقبال نے شمع امید روشن کی، اس نے کہا کہ ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے کہ جب ہماری آرزو پوری ہو گی، اور ایک مشت خاک بھی اہمیت کی مستحق سمجھی جائیگی—

آرزو را دردل خود زندہ دار
تانگرد و مشت خاک تو مزار
آرزو صید مقاصد را کمند
دفتر افعال را شیرازہ بند

اقبال کی نگاہ میں جس کے دل کے عمیق ترین حصہ میں امید جاگزین نہیں ہو گی، اس کی کامیابی مشکل ہے، کیونکہ زندگی میں کامیابی بہت حد تک امید پہ منحصر ہے —

زندگی سرمایہ دار از آرزو ست
عقل از زائدگان بطن اوست

حقیقت یہ کہ اگر آرزو و تمنا نہ ہوتی تو شاید دنیا میں انسان کا زندہ رہنا ہی مشکل ہوتا، آرزو گویا انسان کے مردہ جسم میں تازہ خون کی لہر دوڑا دیتی ہے

گرم خون انسان ز داغ آرزو
آتش این خاک از چراغ آرزو

پھر آرزو تمنا کے ساتھ ساتھ حصول قوت کی بھی ضرورت ہے کیونکہ کمزوری انسان کو منزل مقصد تک پہنچنے سے روک دیتی ہے، بلکہ اس کی زندگی کو یکسر ناکام بنا دیتی ہے، ع—

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات

اقبال نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے ایک با عمل زندگی کا سبق سیکھا ہے، کیونکہ حضور صلعم تیرہ سال تک صدھا تکالیف برداشت کرتے رہے یہانتک کہ مادر وطن سے ہجرت بھی کرنا پڑی، مدینہ کی زندگی میں آرزو کے ساتھ ساتھ حضور صلعم نے قوت بھی حاصل کی چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال ہی میں جنگ بدر ہوئی، جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے انتہائی حکمت و فراست کا ثبوت دیا اور قوت استعمال کی۔ اسطرح آنحضرت صلعم مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کے داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوئے اور اللہ کا دین قائم ہوا، چنانچہ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے حجتہ الوداع کے دن آنحضرت ص کو تکمیل دین کی خوشخبری ملی، الیوم اکلمت لکم دینکم واتممت علنکم نعمتی و رضیت لکم اسلام دینا — آج کے دن تمہارا دین مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کی، اور تمہارے لئے اسلام کو ضابطہ حیات کی حیثیت سے پسند کیا، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مجاہدانہ زندگی کے شروع میں انتہائی بے کسی و بے بسی کے عالم میں بھی امید و آرزو کی شمع جلتی ہوئی نظر آتی ہے اور ہمت کے ساتھ طاقت و قوت حاصل کرنا، مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا، صبر و تحمل کا ثبوت دینا، انتھک محنت و غیر معمولی مشقت جھیلنا، ان تمام منازل سے حضور ص کو گذرنا پڑا اور اس کے بعد کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے اور یہی چیزیں فلسفہ اقبال کی خصوصیات ہیں۔

بمصطفی برسان خویش را کہ دین ہمیں اوست
اگر بـاو نرسیدی تمام بولہبی است

قارئین سے ایک التماس

اقبال اکادمی کوشش کر رہی ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی کے متعلق جس قدر معلومات فراہم ہوسکیں جمع کرے تا کہ علامہ اقبال کی ایک مبسوط اور مفصل سوانح حیات ترتیب دی جاسکے، لہذا اقبال ریویو کے قارئین سے التماس ہے کہ وہ اس کوشش میں اکادمی کا ہاتھ بٹائیں ۔ برائے مہربانی آپ جو کچھ بھی علامہ اقبال کے متعلق ذاتی واقفیت کی بناء پر یا اپنے دوستوں اور عزیزوں کی معرفت جانتے ہیں، ایڈیٹر اقبال ریویو کو لکھ کر بھیجدیں ۔ علامہ اقبال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط اور مسودات کی عکسی نقول اور علامہ اقبال کی اصل تصاویر کی کاپیاں خوشی سے قبول کی جائیں گی۔

THE IQBAL ACADEMY, PAKISTAN

(Block No. 84, Pakistan Secretariat, Karachi-1).

PUBLICATIONS ALREADY OUT:

1. "Iqbaliyat ka tanqidi jaeza" (Urdu) by Qazi Ahmad Mian Akhtar Junagadhi.
2. "Iqbal ke khutoot Attiya Begum ke Naam" (Urdu translation) by Mr. Z. A. Barni.
3. "Iqbal Iranion ki Nazar Men" (Urdu) by Dr. K. A. H. Irfani.
4. "Maktoobat-i-Iqbal" (Urdu) by Syed Nazir A. Niyazi.
5. "Islami Tasawwuf aur Iqbal" (Urdu) by Dr. A. S. Nuruddin.
6. "Iqbal ke Akhri do saal" (Urdu) by Dr. A. H. Batalvi.
7. "Iqbal aur Hyderabad Deccan" (Urdu) by Nazar Hyderabadi.
8. "Asrar-o-Rumuz per ek nazar" (Urdu) by Prof. Mohammad Osman.
9. "Iqbal aur siyasat-i-Milli" (Urdu) by Raees Ahmad Jafri.
10. "Ilmul Iqtisad" (Urdu) by Allama Sir Mohammad Iqbal.
11. "Kalam-i-Iqbal" (Bengali) by Kavi Gholam Mustafa.
12. "Iqbal's Educational Philosophy" (Bengali translation) by S. A. Mannan.
13. "Political Thoughts of Iqbal" (Bengali) by Maulana Mohd. Abdur Rahim.
14. "Historical Background of Pakistan" (Bengali) by S. A. Mannan.
15. "Hayat-i-Iqbal" (Sindhi) by Professor Lutfullah Badvi.
16. "Javid Namah" (Sindhi translation) by Professor Lutfullah Badvi.
17. "Armaghan-i-Hijaz" (Sindhi translation) by Professor Lutfullah Badvi.
18. "Zuboor-i-Ajam" (Gujrati translation) by S. Azimuddin Munadi.
19. "Zuboor-i-Ajam" (Pashto translation) by S. M. Taqveemul Haq.
20. "Baang-i-Dara" (Pashto translation) by S. Rahat Zakheli.
21. "Zarb-i-Kaleem" (Persian translation) by Dr. K. A. H. Irfani.
22. "Asrar-o-Rumuz" (Arabic translation) by Dr. Abdul Wahab Azaam.
23. "Reconstruction of Religious Thought in Islam" (Arabic translation) by Dr. Abbas Mahmood.
24. "Introduction to the Thought of Iqbal" (English translation) by M. A. M. Dar.
25. "First Principles of Education" (English) by Dr. Mohammad Rafiuddin.
26. "Payam-i-Mashriq" (German translation) by Dr. Annemarie Schimmel.
27. "Iqbal Review" Vol. I, No. 1, (English), April, 1960.
28. "Iqbal Review" Vol. I, No. 2, (Urdu) July, 1960.
29. "Iqbal Review" Vol. I, No. 3, (English) Oct., 1960.
30. "Iqbal Review" Vol. I, No. 4, (Urdu) Jan., 1961.
31. "Iqbal Review" Vol. II, No. 1, (English) April, 1961.
32. "Iqbal Review" Vol. II, No. 2, (Urdu) July, 1961.
33. "Iqbal Review" Vol. II, No. 3, (English) Oct., 1961.
34. "Iqbal Review" Vol. II, No. 4, (Urdu) Jan., 1962.
35. "Iqbal Review" Vol. III, No. 1, (English) April, 1962.
36. "Iqbal Review" Vol. III, No. 2, (Urdu) July, 1962.
37. "Iqbal Review" Vol. III, No. 3, (English) Oct., 1962.
38. "Iqbal Review" Vol. III, No. 4, (Urdu) Jan., 1963.

BOOKS UNDER PRINT OR READY FOR BEING PRINTED:

1. "Payam-i-Mashriq" (Pashto translation) by Sher Mohammad Mainosh.
2. "Javid Namah" (Pashto translation) by Amir Hamza.
3. "Baal-i-Jibreel" (Pashto translation).
4. "Armaghan-i-Hijaz" (Pashto translation).
5. "The Place of God, Man and the Universe in the Philosophic System of Iqbal" (English) by Dr. Jamila Khatoon.
6. "Bibliography of Iqbal" (English) by Khawaja Abdul Waheed.
7. "The Concept of Perfect Man in Iqbal" (English) by Miss Hasiena Shaikh.
8. "Essays on Iqbal" (English) by several writers.
9. "Malfuzat-i-Iqbal" (Urdu) by Syed Nazir A. Niyazi.
10. "Iqbal aur Jamaliyat" (Urdu) by Nasir Ahmad Nasir.
11. "Armaghan-i-Hijaz" (Bangali translation) by Gholam Samdani Quraishi.
12. "The Development of Metaphysics in Persia" (Bengali translation) by Kamal-uddin Khan.
13. "Zarb-i-Kaleem" (Bengali translation) by S. Abdul Mannan Talib.
14. "Payam-i-Mashriq" (Turkish translation) by Dr. Ali Nihad Tarlan.
15. "Asrar-o-Rumuz" (Turkish translation) by Dr. Ali Nihad Tarlan.
16. "Payam-i-Mashriq" (Gujrati translation) by S. Azimuddin Munadi.
17. "Life of Iqbal" (Gujrati) by Ghulam Husain Mustafa.

BOOKS UNDER COMPILATION:

1. "Malfuzat-i-Iqbal" (Urdu) by Syed Nazir A. Niyazi—2nd volume.
2. "Iqbal's letters to poet Girami" (Urdu) by A. A. Hafiz Jallundhari.
3. "Iqbal's Note on Nietschze" (English) by Syed Nazir A. Niyazi.
4. "Hikmat-i-Iqbal" (Urdu) by Dr. Mohammad Rafiuddin.
5. "A selection of Iqbal's poems" (Pashto translation).
6. "Zarb-i-Kaleem" (Pashto translation).
7. "Pas Che Bayad Kard" (Pashto translation).
8. "Iqbal's Letters to Jinnah" (Pashto translation).
9. "Speeches and Statements of Iqbal" (Pashto translation).
10. "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" (Italian translation) by Madam Sufi Huri Hanum.
11. "Asrar-o-Rumuz" (Sindhi translation) by Professor Lutfullah Badvi.
12. "Index of Iqbal's books" (Urdu) by K. A. Waheed.
13. "Iqbal aur Unki Siyasi Zindagi" (Urdu) by Sirajuddin.